دسمبر ۱۹۸۷ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
ہدایت القرآن (۲۰)	مولانا محمد تقی امینی	۳
درسِ قرآن (سورۂ محمدؐ، قسط نمبر ۹)	ڈاکٹر اسرار احمد	۹
حکمتِ اقبال (۹)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۲۱
ربوٰا اور مضاربت میں فرق	مولانا محمد طاسین	۳۳
نقطۂ نظر (مغربی سائنس دانوں کی علمی خیانت)	ڈاکٹر حافظ محمد مقصود	۴۳
تذکیر و موعظت (علم دین کا حصول، وقت کی اہم ضرورت)	لطف الرحمن خان	۵۳
اشاریہ حکمتِ قرآن (۱۹۸۷ء)	مرتب: حافظ خالد محمود خضر	۵۷

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کہا اقبالؔ نے شیخِ حرم سے
تہہِ محرابِ مسجد سو گیا کون!
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

تہہ محراب مسجد سو جانے اور فرنگی بتکدے میں کھو جانے والوں کو بیک وقت جھنجھوڑنے اور صحافت میں ماضی قریب کی پُرعزیمت روایات کو زندہ کرنے کی ایک کوشش انشاءاللہ عنقریب.....

ہفت روزہ

ندا

کی شکل میں منظرعام پر آئے گی۔

یکے از مطبوعات

محمد حمید احمد پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۴۱۔ اے شاہراہ پاکستان (لوئر مال) لاہور۔ ۱
فون ۸۔۳۲۰۱۹۶

قرآن اکیڈمی لائبریری

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمت قرآن

لاہور

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم، ایم اے، پی ایچ ڈی،

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

مینجنگ ایڈیٹر: اقتدار احمد

جلد ۶ | دسمبر ۱۹۸۷ء بمطابق ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ | شمارہ ۱۲

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بحری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون ۴۰/- روپے فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

الحمدللہ کہ اس شمارے کے ساتھ ہی 'حکمتِ قرآن' کی چھٹی جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی ہے ۔ قارئین کی دلچسپی اور سہولت کے پیشِ نظر اس شمارے میں سال رواں کے دوران شائع ہونے والے جملہ مضامین و مقالات کی ایک مکمل فہرست شاملِ اشاعت کردی گئی ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اس روایت کا آغاز گذشتہ سال ہوا تھا جب سال کے اختتام پر ہم نے پہلی بار حکمتِ قرآن کے ابتدائی شمارے سے لے کر، جو مارچ ۸۲ء میں شائع ہوا تھا ۔ دسمبر ۸۶ء تک کے مضامین کا مکمل اشاریہ شائع کیا تھا ۔ آئندہ بھی ہماری کوشش ہوگی کہ سال کے آخر پر دورانِ سال شائع شدہ مضامین و مقالات کا اشاریہ شائع کرنے کی اس روایت کو برقرار رکھا جائے ۔

اشاریے کی سال بہ سال اشاعت جہاں ایک طرف قارئین کے لئے باعثِ افادہ و سہولت ہے وہاں خود ادارے کے لئے خود احتسابی کا ذریعہ بھی ہے ۔ اس پہلو سے جب ہم اپنی سالِ رواں کی کارگزاری پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ اطمینان تو ضرور ہوتا ہے کہ اس سال کے دوران پرچے کی اشاعت میں خاصی باقاعدگی رہی ہے ۔ سال بھر میں صرف ایک موقع ایسا آیا تھا جب ہماری کوتاہی کے باعث دو ماہ کا مشترک شمارہ شائع ہوا ۔ بقیہ سال میں ، الحمدللہ ، پرچہ ہر ماہ شائع ہوتا رہا ہے ۔ پھر یہ کہ پرچے کے معیارِ کتابت و طباعت یعنی حسنِ ظاہری میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے جو محسوس و مشہود ہے ۔ تاہم بعض دوسرے پہلوؤں سے بہتری کی کافی گنجائش ہم محسوس کرتے ہیں ۔ اگرچہ بالعموم معیاری علمی مضامین ہی مطالعے کے لئے پیش کئے جاتے رہے ہیں ، تاہم یہ وہ گوشہ ہے جہاں بہتری کی گنجائش ہر دم موجود رہتی ہے ۔ اس سال ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کی دو معرکۃ الآرا تصانیف ، **'منشورِ اسلام'** اور **'حکمتِ اقبال'** بالاقساط پرچے کی زینت بنتی رہی ہیں ، جن کی وجہ سے اگرچہ پرچے میں تنوّع کی کچھ کمی محسوس کی گئی تاہم ان مضامین کی علمی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور اس کا اعتراف بارہا قارئین کی جانب سے کیا جاتا رہا ہے ـــــ ان سطور میں پورے سال کا

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

(۲۰)

ہدایتُ القرآن

مولانا محمد تقی امینی

شرعی حکم پر عمل کرنے میں زندگی کی صلاحیت

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا تا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ

اور جب تم ایک شخص کو قتل کر کے ایک دوسرے پر الزام لگا رہے تھے حالانکہ اللہ اس چیز کو ظاہر کرنے والا تھا جس کو تم چھپاتے تھے پھر ہم نے کہا مقتول پر اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو اسی طرح اللہ مُردوں کو زندہ کرے گا۔ اور تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو[1]

○

[1] دوسری بات مرنے کے بعد روح کے باقی رہنے کو دکھاتا ہے۔ بستی کے ایک آدمی کا قتل ہو گیا تھا جس کے قاتل کا پتہ نہ چلتا تھا اور ہر ایک دوسرے کو قاتل ٹھہرا رہا تھا۔ اللہ کی تدبیر نے یہ راستہ بتایا کہ ذبح کی ہوئی گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم پر مارو اس سے مقتول زندہ ہو کر قاتل کو بتا دے گا۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور مقتول نے اپنے قاتل کو بتا دیا اور پھر مر گیا۔ اس واقعہ سے مرنے کے بعد دوسری زندگی کا ثبوت فراہم ہوا جس طرح یہاں روح جسم میں دوبارہ واپس ہوئی اسی طرح ہر ایک کی روح اس کے جسم میں واپس ہو کر دوبارہ زندگی ملیگی۔

اس حکم پر عمل کرنے سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ لوگ جس حکم کو بے معنی اور بے مصلحت سمجھ رہے تھے اس میں کس قدر معنویت اور مصلحت تھی کہ اسی کے ذریعہ مردہ کو زندہ کیا گیا۔ اسی طرح اللہ کے تمام حکموں میں بڑی معنویت، مصلحت اور مردہ قوموں میں زندگی کی روح پھونکنے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن لوگوں کی پہونچ ان تک نہیں ہو پاتی ہے۔ اس بنا پر کٹ حجتیاں کرتے اور طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

بے حسی و گراوٹ کی انتہا

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ تا عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

پھر تمہارے دل[1] اس کے بعد سخت ہو گئے[2] جیسے کہ وہ پتھر کی چٹانیں ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت[3] اور بعض پتھر کی چٹانیں تو ایسی ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بعض ایسی ہیں جو پھٹ جاتی ہیں اور ان سے پانی بہہ نکلتا ہے اور بعض ایسی ہیں جو اللہ کے ڈر سے لرز کر گر پڑتی ہیں اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں ہے۔

○

[1] قرآن نے مختلف جگہوں میں قلب (دل) کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوت کا نام ہے جس کا تعلق سمجھ بوجھ سے بھی ہے اچھائی برائی سے بھی ہے اور اثر کرنے و اثر قبول کرنے سے بھی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نیکی و بھلائی کے کام کرتے رہنے سے یہ قوت بحال رہتی اور بڑھتی رہتی ہے اور اس کے خلاف کرتے رہنے سے یہ قوت گھٹتی رہتی اور بالآخر زنگ آلود ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔

[2] یہ قومی و جماعتی زندگی کی اس حالت کا ذکر ہے جبکہ بے حسی و گراوٹ انتہا کو پہونچ جاتی ہے اور "دل" وعظ و نصیحت اور خبردار کرنے والے واقعات سے اثر لینا چھوڑ دیتا ہے۔ اس وقت دل کی قوت ختم ہو جاتی اور وہ مر جاتا ہے۔

[3] دل کی سختی و بے حسی میں پتھر کی مثال دی جاتی ہے لیکن ایسی حالت میں دل پتھر سے بھی زیادہ سخت اور بے حس ہو جاتے ہیں اس طرح کہ پتھر، پتھر ہونے کے باوجود اندر و باہر کا اثر قبول کر کے نفع پہنچاتے ہیں۔ مثلاً بعض پتھر کی چٹانوں سے چشمے جاری ہو جاتے اور نہریں بہہ نکلتی ہیں جن سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے اور بعض پھٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتی ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے۔ ان سے بھی لوگوں کو نفع پہنچتا ہے اور بعض پتھر کی چٹانیں ایسی ہیں جن پر کبھی اللہ کا خوف طاری ہو جاتا اور اپنی جگہ سے لڑھک جاتی ہیں۔ پہلی دو مثالیں اندرونی اثر قبول کر کے لوگوں کو نفع پہنچانے کی تھیں۔ اور یہ تیسری باہر کا اثر قبول کر کے خود کو نفع پہنچانے کی ہے۔

آیت میں قومی و جماعتی زندگی کی جس حالت کا ذکر ہے اس میں دل نہ اندر کا اثر قبول کرتا ہے اور نہ باہر کا اثر قبول کرتا ہے۔ نہ لوگوں کو نفع پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ خود کو نفع پہنچاتا ہے۔ پتھر سخت ہونے کے باوجود نفع پہنچاتا ہے۔ اس لئے باقی رہتا ہے اور دل سخت ہونے کے بعد نقصان پہنچاتا ہے اس لئے اس کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ دنیا میں ہر چیز کے باقی رہنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ نفع پہنچاتی ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ مٹا دی جاتی ہے۔ یہی حال قوموں اور جماعتوں کا ہے۔ یہاں وہی باقی رکھی جاتی اور عزت و اقتدار کی حقدار ہوتی ہیں جو نفع پہنچاتی ہیں اور جو ایسی نہیں ہیں مٹا دی جاتی ہیں۔

جدید دنیا نے ابھی دل کی قوت و صلاحیت کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی ہے یا اس کی پہنچ ابھی تک نہیں ہوسکی ہے جس کی بنا پر اس کے یہاں دل کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتی ہیں لیکن قرآن و سنّت میں دل سے متعلق نہایت مضبوط باتیں پائی جاتی ہیں جن کا زندگی کے حالات و تجربات میں ثبوت موجود ہے۔ [عہ]

علماء اور عوام دونوں کی حالتِ زار

أَفَتَطْمَعُونَ تا مَا لَا تَعْلَمُونَ

کیا تم (مسلمان) یہ امید رکھتے ہو کہ تمہارے کہنے سے وہ ایمان لے آئیں گے۔ حالانکہ ان میں ایک گروہ (علماء) ایسا رہا جو اللہ کا کلام سنتے ہیں پھر سمجھنے کے بعد دیدہ و دانستہ اس کو بدل دیتے ہیں[1] اور جب وہ مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے سرغنہ دوستوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کیا تم ان کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں کہ وہ تمہارے رب کے پاس تمہیں سے لے کر دلیل پیش کریں کیا تم اتنی بات نہیں سمجھتے ہو کیا ان کو نہیں معلوم کہ اللہ جانتا ہے جس کو وہ چھپاتے ہیں اور جس کو وہ ظاہر کرتے ہیں[2]۔ اور ان میں ان پڑھ عوام ہیں جن کے پاس اللہ کی کتاب کا علم نہیں ہے صرف ان کی بے حقیقت

عہ ملاحظہ ہوں راقم کی کتابیں تہذیب کی تشکیلِ جدید۔ حدیث کا درایتی معیار اور حکمت القرآن وغیرہ

آرزوئیں اور خواہشیں ہیں جن کی حیثیت اٹکل پچو کی باتوں سے زیادہ نہیں ہے۔
افسوس ہے ان لوگوں (علماء) پر جو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ
یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے کچھ فائدہ حاصل کریں۔ پھر افسوس ہے
ان کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے پر اور افسوس ہے ان کی اس کمائی پر۔[۳]

O

[۱] جس طرح گاڑی چلانے اور اس کو کھائی و خندق سے بچانے کے لئے تجربہ کار ڈرائیور کی ضرورت ہے اسی طرح زندگی کی گاڑی چلانے اور اس کو کھائی و خندق سے بچانے کے لئے علماء و قائدین کی ضرورت ہے اور جس طرح ڈرائیور کے بغیر "اسٹیم" کی طاقت نہ منزل پر پہنچا سکتی ہے اور نہ لائن کی درستگی و ہمواری کچھ مفید ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح علماء و قائدین کے بغیر "جوش و جذبہ" سے نہ کچھ کام چلتا ہے اور نہ حالات کی سازگاری و فضاء کی ہمواری آگے بڑھا سکتی ہے۔

پھر علماء و قائدین کی دیانت و بددیانتی اور ان کی اچھی بری زندگی کا قوم و جماعت پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ قوم و جماعت ان کی پیروی کرتی، ان کی نقل کرتی اور ان کے نقش قدم پر چلتی ہے اسی بناء پر آیت میں یہودیوں کے علماء کی بددیانتی کا ذکر ہے کہ وہ ان کی زندگی میں یہاں تک سرایت کر چکی ہے کہ اللہ کے کلام میں بھی ردوبدل کرتے رہتے ہیں کہیں اصل کی جگہ دوسری بات پیش کر دی کہیں اصل مطلب بدل دیا کہیں کچھ گھٹا دیا اور کہیں کچھ بڑھا دیا۔ غرض دنیا کمانے اور دنیوی فائدہ حاصل کرنے کے لئے جس طرح چاہتے جان بوجھ کر اس کو ڈھال لیتے تھے۔

اللہ کی کتاب اور اس کے احکام میں رد و بدل یہودیوں کے علماء کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ پستی و زوال کے زمانے میں ہر قوم کے علماء و پیشوا بھی اپنی ساکھ جمانے، اپنا اقتدار برقرار رکھنے اور دنیوی فائدہ حاصل کرنے کے لئے یہی سب کچھ کرتے آئے ہیں لیکن اس ردّوبدل سے اسی وقت کام چلا ہے جب تک کوئی زندہ قوم و جماعت نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ میدان میں نہیں آئی۔ اس کے میدان میں آنے کے بعد بہت سی حقیقتیں ابھر کر سامنے آتی

رہیں اور یہ "فراڈ" جو اللہ کے ساتھ کیا جا رہا ذلت و رسوائی کا باعث بنتا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کے علماء ایسے دین فروش ہوں کہ اللہ کی سچی بات بھی نہ پیش کریں ان سے کیا توقع ہے کہ قوم کی رہنمائی کر کے اس کو منزل پر پہنچا سکیں گے۔

۲ے تورات میں دین کی بہت سی باتیں ایسی موجود تھیں جو مسلمانوں کے موافق تھیں۔ ان میں آخری کتاب قرآن اور آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کا ذکر بھی تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ گفتگو کے درمیان کوئی ایسی موافق بات کسی کی زبان سے نکل جاتی اور اس کی اطلاع دوسروں کو پہنچتی تو آپس میں ایک دوسرے کو سمجھاتے کہ تم کیسے ناسمجھ لوگ ہو کہ ان کے موافق باتیں بتا کر اپنا کیس کمزور کر رہے ہو اور اپنی ہی کتاب سے ان کو سند و قوت پہنچا کر ان کے لئے دلیل مہیا کر رہے ہو جس سے وہ اس دنیا میں بھی اور اللہ کے روبرو کام لیں گے۔ اللہ کو ان کی یہ ریشہ دوانیاں سب معلوم ہیں خواہ اسے وہ ظاہر کریں یا چھپائیں لیکن ان کی حرکتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا اللہ کے علم کی ان کو خبر نہیں ہے۔

۳ے علماء کا حال یہ ہے اور ان کے عوام کی زندگی کا سرمایہ صرف خوش فہمی کی آرزوئیں اور نادانی کا جوش و خروش ہے۔ ایسی حالت میں پستی سے ترقی کی طرف اور بدحالی سے اصلاحِ حال کی طرف تبدیلی کی توقع بے سود ہوتی ہے۔ ان کی اس حالت پر سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کچھ نہیں رہ جاتا ہے۔

اللہ کے قانون میں یکسانیت

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ تا هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ

اور کہتے ہیں کہ (ہم نجات یافتہ ہیں) دوزخ کی آگ ہمیں کبھی نہ چھوئے گی اور اگر آگ میں ڈالے بھی گئے تو چند دن کے لئے لے آپ ان سے کہیے کہ کیا تم نے اللہ سے کوئی وعدہ لے رکھا ہے (یا لکھا رکھا ہے) کہ وہ اس کے خلاف نہ کریگا یا تم اللہ کی طرف ایسی بات نسبت کرتے ہو جس کو تم جانتے نہیں ہو۔ ہاں جنہوں نے گناہ کئے اور گناہوں نے ان کو پوری طرح قابو میں لے لیا تو یہی لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے یہی لوگ

جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ؎۲

؎۱ علماء و عوام کی اس حالت کے باوجود یہودی قوم اپنے کو اللہ کا پیارا و لاڈلا سمجھتی اور دوزخ میں جانے والی قوموں کی فہرست سے علیحدہ رکھتی تھی (کچھ دن کیلئے دوزخ میں جانے کا شمار نہ تھا) البتہ جنت میں والی قوموں میں یہودی سرفہرست تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے جنت و دوزخ میں جانے کی بنیاد ایمان وعمل صالح کی بجائے ذات برادری اور مذہبی گروہ بندی پر رکھ چھوڑی تھی

؎۲ آیت میں اس حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ اللہ کے قانون میں ہمیشہ یکسانیت رہی ہے۔ کسی قوم کی نادانیوں اور خوش فہمیوں سے کبھی اس میں تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ اب ہو گی۔ اس قانون میں جنت و دوزخ میں جانے کی بنیاد ایمان وعمل صالح پر رکھی گئی ہے۔ ذات برادری اور مذہبی گروہ بندی کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ ایمان وعمل صالح کے بجائے ان چیزوں کو دخیل بنانے میں بڑا الزام (معاذ اللہ) اللہ پر یہ آتا ہے کہ اس نے ایک ایسی بات کو بنیاد قرار دیا جو انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ کون کس ذات برادری اور گروہ میں پیدا ہو گیا انسان کے اختیار کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ البتہ ایمان وعمل صالح کا تعلق انسان کے اختیار و ارادہ سے ہے اور اس میں سب کی حیثیت یکساں ہے۔ اس بنا پر اللہ نے ہر دور و زمانہ اور ہر قوم میں اسی کو جنت و دوزخ میں جانے کی بنیاد قرار دیا اور اسی کو شرافت و فضیلت کا پیمانہ مقرر کیا۔ ایمان وعمل صالح کی تفصیل یہاں نہیں ذکر کی گئی اور نہ اس کا یہ محل ہے۔ جو چیز جس جگہ ذکر کرنے کی ہو اس کو ہمیشہ اسی جگہ تلاش کرنا چاہیئے پھر کوئی نتیجہ نکالنا چاہیئے۔ صرف ایک کو دیکھ کر اور اس سے متعلق دوسری چیزوں کو چھوڑ کر نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے۔ اور یہودیوں کا جس قدر برا حال بیان کیا گیا ہے قوموں کی تاریخ میں یہ انہیں کا حال نہیں ہے بلکہ گراوٹ و پستی میں مبتلا ہر قوم کا وہی حال ہوتا ہے جو قرآن نے یہودیوں کا بیان کیا ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں ایک ایک کر کے وہ خرابیاں موجود ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ نادانی اور خوش فہمی کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ جس کی بنا پر ان کو دیکھنے اور سمجھنے میں دشواری ہو رہی ہے۔ علماء و عوام کوئی بھی الگ نہیں ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ اپنا اپنا پارٹ ادا کر رہا ہے۔

(جاری ہے)

●●●

(۹)

درسِ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ترتیب و تسوید: جمیل الرحمٰن / عاکف سعید

گزشتہ سے پیوستہ

اہل ایمان سے اللہ تعالیٰ کے وعدے

سورۃ محمدؐ کی ابتدائی چار آیات کا مطالعہ مکمل ہو چکا ہے۔ اب آگے چلئے! فرمایا سَيَهْدِيهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ ○ "اللہ تعالیٰ ان اہل ایمان کو راہ یاب فرمائے گا۔ ان کی راہنمائی فرمائے گا اور ان کے احوال کی اصلاح فرمادے گا"۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو جو اہل ایمان ہیں' کامیاب کرے گا اور جنت جو کامیابی کی سب سے بڑی جگہ اور 'الفوز العظیم' ہے' وہاں تک پہنچادے گا۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ ہدایت کے معنی راستہ دکھانا بھی ہے' اس پر چلنے کی توفیق دینا بھی ہے اور منزل تک پہنچانا بھی ہے۔ تو گویا یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راہ حق میں مقتول ہونے والوں کو ان کی منزلِ مراد تک پہنچادے گا۔ ساتھ ہی یہ خوش خبری بھی دے دی۔ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ "اور ان کے احوال درست فرمادے گا" یعنی اگر کوئی خطا ہو گئی تھی تو معاف فرمائے گا۔ عمل میں اگر کوتاہیاں رہ گئی تھیں' تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کی تلافی فرمادے گا۔ اور اللہ کے اس فضل اور انعام کا نتیجہ اس صورت میں نکلے گا کہ وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ "اور وہ ان کو داخل کرے گا اس جنت میں جس کی ان کو پہچان اس نے پہلے ہی کرا دی تھی۔ جس سے وہ پہلے ہی سے واقف اور متعارف کرا

دیئے گئے تھے" ۔ جنت کی نعمتوں اور آسائشوں کا ذکر اس سورۂ مبارکہ میں بھی آئے گا پھر مکی قرآن مجید نازل ہو چکا تھا۔ جس میں جنت کی نعمتوں کا بار بار ذکر ہے..... سورۂ الرحمٰن پڑھئے' سورۂ الواقعہ پڑھئے تو جنت کی نعمتوں کا ایک ہلکا سا نقشہ آپ کے سامنے آجائے گا۔ ہلکا سا نقشہ میں نے اس لئے کہا ہے کہ جنت کی نعمتوں کے لئے حضورؐ کا ارشاد ہے کہ:

مالا عین رأت و لا اذن سمعت و لا علیٰ قلب بشر خطرت "اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے جنت کی نعمتیں وہ ہیں کہ جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں' نہ کسی کان نے سنیں نہ کسی انسان کے دل میں اس کا کوئی خیال تک آیا۔" تو یہاں فرمایا۔: وَ یُدۡخِلُهُمُ الۡجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمۡ ○

نصرتِ الٰہی کے حصول کا یقینی طریقہ، نصرتِ خدا اور رسولؐ

اب ایک اہم آیت آرہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی نصرت فرمانے کا ایک یقینی ضابطہ' قاعدہ' اصول اور اپنی ایک مستقل سنت کو بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ یَنۡصُرۡكُمۡ وَ یُثَبِّتۡ اَقۡدَامَكُمۡ ○

"اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو (کفار کے مقابلہ میں) مضبوطی سے جمادے گا۔"

اس آیت مبارکہ کی تفہیم کے لئے اس کے شانِ نزول کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ مجھے ان مفسرین سے اتفاق ہے جن کی رائے یہ ہے کہ یہ سورتِ مبارکہ غزوہ بدر سے متصلاً قبل نازل ہوئی ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ بدر کے اثناءِ سفر میں اس سورۃ کا نزول ہوا ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کا پیشِ منظر غزوہ بدر ہے جو وقوع پذیر ہونے والا ہے۔ اہلِ ایمان کو معلوم ہے کہ جس لشکر سے مڈبھیڑ ہونے والی ہے اس کی تعداد ایک ہزار ہے' وہ پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہے۔ اس کے ساتھ دو سو گھڑ سواروں کا دستہ ہے۔ جبکہ مسلمانوں کے لشکر کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی تعداد صرف تین سو تیرہ ہے۔ دشمن کی تعداد کے مقابلہ میں ایک تہائی سے بھی کچھ کم۔ لشکر میں صرف دو گھوڑے ہیں۔ ہتھیاروں کا حال یہ ہے کہ کسی کے پاس تلوار ہے تو ڈھال نہیں۔ کسی کے پاس نیزہ ہے تو تلوار نہیں۔ کسی کے

پاس تیر کمان ہے تو اس کے پاس نہ نیزہ ہے' نہ تلوار ہے نہ ڈھال ہے گویا اسلحہ کے اعتبار سے بھی دشمن کے مقابلے میں بے سروسامانی کی سی حالت ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل ایمان کا یہ لشکر بلکہ جسے لشکر کے بجائے دستہ کہنا مناسب ہو گا' مدینہ سے کسی بڑے لشکر سے مقابلہ کے لئے نکلا ہی نہیں تھا۔ مدینہ سے روانہ ہونے کے موقعہ پر تو اُس تجارتی قافلہ پر تاخت پیش نظر تھی جو ابو سفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آ رہا تھا۔ جس کے ساتھ صرف پچاس کی مسلح نفری بطور محافظ تھی۔ مدینہ سے کافی دور نکل جانے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ ابو سفیان کی ہنگامی درخواست پر مکّہ سے ایک ہزار جنگجوؤں پر مشتمل پوری طرح مسلح لشکر مدینہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا اور اس کے نتیجہ میں ابو سفیان کے تجارتی قافلہ کے بجائے مکہ سے روانہ ہونے والے لشکر کی طرف چلنے کا فیصلہ ہوا۔ جس کا قدرے تفصیل سے ذکر میں پچھلی نشستوں میں کر چکا ہوں۔

اس تناظر میں دیکھئے کہ اہل ایمان کی یہ تشویش فطری تھی کہ مقابلہ برابر کا نہیں ہے۔ نہ تعداد کے لحاظ سے نہ سامانِ جنگ کے اعتبار سے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھارس بندھائی جا رہی ہے' تسلی دی جا رہی ہے کہ تشویش کیوں کرتے ہو! تم اللہ کے دین کی سرفرازی کے لئے نکلے ہو اگر تمہارے عزائم میں' تمہارے ارادوں میں خلوص ہے تو اللہ تمہارا حامی و ناصر ہے۔ تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا..... اور دشمن کے مقابلہ میں تمہارے قدموں کو ثبات عطا فرمائے گا۔

اللہ کی نصرت کس معنی میں!

اللہ تعالیٰ کی صفات کمال لامتناہی ہیں۔ وہ القدیر بھی ہے العزیز بھی۔ وہ القوی بھی ہے اور فعال لّما یرید بھی۔ وہ الغنی بھی ہے اور الصمد بھی۔ اسے اپنی مخلوقات میں سے اپنے لئے کسی مدد' کسی نصرت کی حاجت نہیں ہے۔ یہ تو اس کی شانِ کریمی و رحیمی ہے کہ وہ اپنے دین کے غلبہ' اس کی اقامت اور اس کے اظہار کے لئے سعی و جہد' ایثار و قربانی اور محنت و کوشش کرنے والوں کو اپنا انصار قرار دیتا ہے۔ جیسے سورۃ الصف میں فرمایا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ "اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بنو" اللہ کی نصرت درحقیقت

اس سے دین کے لئے مجاہدہ کا نام ہے۔ اس کا گہرا تعلق درحقیقت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے ہے۔ آپؐ کی بعثت کا امتیازی وصف قرآن مجید میں تین سورتوں۔ سورہ توبہ، سورۃ الفتح اور سورۃ الصف میں ان الفاظ میں بیان ہوا۔ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ تینوں سورتوں میں ایک شوشہ کے بغیر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ گویا اظہار دین الحق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب خصوصی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرض منصبی تن تنہا ادا نہیں فرما سکتے تھے۔ آپؐ کو اس مشن کی تکمیل کے لئے اعوان و انصار درکار تھے اور اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صورت میں ایسے فدائین اور ایسے جان نثار عطا فرمائے جو کسی اور رسول کو عطا نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کو اور صحابہؓ کو سورۃ الفتح میں جمع (BRACKET) کیا گیا ہے۔: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗ میرے نزدیک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اس سے بڑی مداح اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جہاں اپنا انصار قرار دیا ہے وہاں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا معین بھی قرار دیا ہے۔

یہ مضمون سورۃ الاعراف میں بھی آیا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل ایمان کے تعلق کی بنیادیں چار الفاظ کے حوالے سے معیّن فرمائی ہیں۔

آیت کا پس منظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انؑ کی اپنی امت کے لئے رحمتِ خاص کی دعا کے جواب میں بتا دیا تھا کہ میری رحمتِ خاص ان لوگوں کے لئے محفوظ و مختص ہے جو میرے رسول نبی امی کے ساتھ یہ معاملہ کریں گے کہ:

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

"پس جو لوگ اس رسولِ اُمّی پر ایمان لائیں گے اور ان کی تعظیم و توقیر، اس کی عزت و احترام کریں گے اور ان کی نصرت و مدد کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو ان کے ساتھ نازل کیا جائے گا (یعنی قرآن) تو وہی ہوں گے کامل فلاح پانے والے۔"

نصرت کے اس ضابطہ کو سورہ آل عمران کی آیت ۱۶۰ کے پہلے حصہ کے حوالہ سے بھی سمجھ لیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِنْ بَعْدِہٖ اس میں بشارت ویقین دہانی والی بات بھی ہے اور دھمکی والی بات بھی۔ یقین دہانی اور بشارت والی بات یہ ہے کہ : اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ ۔ "اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ آسکے گا۔" ظاہر بات ہے کہ جس کا اللہ پشت پناہ اور حامی وناصر بن جائے تو کیا اس پر کوئی اور غالب آسکتا ہے! ہرگز نہیں۔ دھمکی والی بات یہ ہے کہ : وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِنْ بَعْدِہٖ "اگر اللہ ہی تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو کون ہے وہ جو تمہاری مدد کرسکے اس کے بعد۔"

سُنّتِ الٰہی

اس بات کو جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ دنیوی اغراض کے لئے جنگوں کے ضمن میں خالص مادّی سطح پر معاملہ کرتا ہے یہی معاملہ کفار کی آپس کی جنگوں کا بھی ہوتا ہے۔ ایسی جنگوں میں حساب کتاب، مادّی وسائل اسباب، تعداد کی کمی بیشی اور حوصلوں کی پختگی اور کمزوری فیصلہ کن ہوتی ہے۔ خالص دین کے لئے جنگ کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے معیارات بالکل جدا ہیں۔ یہ معیار معلوم کرنا ہے تو حضرت طالوت کا جالوت جیسے باجبروت اور عسکری لحاظ سے نہایت مضبوط لشکر کا انجام دیکھو جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں موجود ہے جہاں مومنین صادقین کا یہ قول نقل ہوا ہے: کَمْ مِنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃًۢ بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ○ "بارہا تھوڑی جماعت غالب ہوئی ہے بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" مومنین صادقین کی اللہ اپنے فضلِ خاص سے نصرت بھی کرتا ہے اور ان کو ثبات واستقامت بھی عطا فرماتا ہے۔

غزوۂ بدر کے لئے بشارت کا پہلو

اس آیتِ مبارکہ میں اس لشکر کے لئے جو بدر کے میدان کی طرف قتال فی سبیل اللہ کے لئے جارہا تھا، فتح وکامرانی کی بشارت اور نوید بھی موجود ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کی سرفروشی اور

جان نثاری کا یہ نتیجہ نکلا کہ تین سو تیرہ کے بے سروسامان لشکر نے مشرکین مکہ کے کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کے لشکر کو شکستِ فاش دی۔ ستر مشرکین واصل جہنم ہوئے جن میں قریش کے صنادید شامل تھے اور ستر افراد اسیر بنائے گئے جبکہ بدر کے میدان میں مسلمانوں کے صرف تیرہ افراد نے جام شہادت نوش کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس دن کو یوم الفرقان قرار دیا یعنی حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والا دن۔

ایک اہم نکتہ

اس آیت مبارکہ پر دوبارہ نظر ڈالئے اور غور کیجئے تو ایک نہایت اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ یہاں اہل ایمان سے جو نصرت اور تثبیتِ اقدام کا وعدہ فرمایا جارہا ہے وہ مشروط ہے اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو مضبوطی سے جمادے گا۔" اللہ کی مدد کرنے سے کیا مراد ہے! وہ ہمارے سامنے آچکا ہے کہ اس سے مراد ہے اس کے دین کی سربلندی کے لئے تن، من، دھن لگا دینا..... اگر ہم اپنا مال اور اپنی جان، اپنا وقت، اپنی صلاحیت، اپنی قوت، اپنی توانائی تو دنیا کمانے میں کھپائیں، اور امیدیں یہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ مشرکین و کفار کے مقابلہ میں ہماری نصرت فرمائے گا اور دین کا غلبہ آپ سے آپ ہو جائے گا تو اس کے متعلق دوٹوک بات سن لیجئے کہ ع ایں خیال است و محال است و جنون۔ اللہ کا وعدہ مشروط ہے۔ یہ دوطرفہ معاملہ ہوگا۔ تم اللہ کے دین کے لئے محنتیں کرو گے، جہاد کرو گے، قربانی و ایثار سے کام لو گے، رضائے الٰہی کے حصول اور فلاحِ اخروی کے لئے یہ سب کچھ کرو گے تو یقیناً اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اگر مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ عنہم) کی جاں گسل محنت، کوشش، جدوجہد نہ ہوتی۔ اگر راہِ حق میں ایثار و قربانی کا جذبہ نہ ہوتا۔ اگر اللہ کے راستہ میں جانیں فدا کرنے کا ولولہ اور حوصلہ نہ ہوتا، اگر مصائب و شدائد کو جھیلنے، برداشت کرنے کی صلاحیت ان میں نہ ہوتی، اگر راہِ خدا میں صبر و ثبات و استقامت کا جوہر ان میں نہ ہوتا تو خود سوچئے کہ کیا اللہ کا دین غالب آسکتا تھا! محنت، ایثار، قربانی، مال و جان فدا کئے بغیر اگر دین غالب ہوسکتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

ہاتھوں ہوتا' جو محبوب رب العلمین ہیں۔ لیکن جب حضورؐ نے اور صحابہ کرامؓ نے دین کے غلبہ کے لئے سعی وجہد کی گویا اللہ کی مدد کی تو اللہ نے بھی ان کی مدد فرمائی۔ یہ ہے ضابطہ اور قانون جو اس آیت مبارکہ میں بیان ہوا ہے کہ۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ گویا بالفاظ دیگر اگر ہم چاہتے ہوں کہ اللہ ہماری مدد فرمائے' وہ ہمارا پشت پناہ بن جائے تو اس کا آسان لیکن یقینی راستہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے دین کی خدمت میں لگ جائیں

اللہ اور بندے کا تعلق دو طرفہ ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے واضح کیا ہے۔ سورہ بقرہ میں فرمایا: فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ ۔ "پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا" ۔ سورہ ابراہیمؑ میں فرمایا: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ۔ "اگر اس دنیا میں تم شکر گزار بندے بن کر رہو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کی روش اختیار کرو گے تو جان رکھو کہ میری سزا بھی بہت سخت ہے" ۔ معلوم ہوا کہ اگر بندے کا اپنے رب سے تعلق صحیح خطوط پر قائم ہے تو اللہ بھی اپنے بندے کے لئے سراپا رحمت وشفقت ہے۔

آگے چلئے فرمایا: وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۔ اور جو لوگ اللہ کی توحید کا ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کا اور یوم آخرت کا انکار کر رہے ہیں' ان کے لئے بربادی ہے' ہلاکت ہے' تباہی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی ساری سعی وجہد کو' ساری بھاگ دوڑ کو بھٹکا کر رکھ دے گا' بے نتیجہ کر دے گا' غیر مؤثر کر دے گا۔ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے تب بھی اللہ کے دین کا بول بالا ہو کر رہے گا۔

اِضلالِ اعمال

آٹھ آیات میں اضلال کا لفظ تین مرتبہ آگیا۔ پہلی آیت میں اور اس آیت میں کفار کے لئے آیا" اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ " اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا اور چوتھی آیت میں اہل ایمان کے لئے آیا" فَلَنْ يُضِلَّ اَعْمَالَهُمْ " اللہ اہل ایمان کے ایمان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہیں فرمائے گا۔ وہ دنیا میں بھی کامیاب اور آخرت میں بھی کامیاب ہوں گے۔ لیکن ان کفار نے دنیا میں اگر کوئی نیکی کی بھی تھی مثلاً حاجیوں کو پانی پلایا تھا' ان کو کھانا کھلایا تھا' ان کی خدمتیں کی تھیں' وہ سب آخرت میں ضائع ہو جائیں گی چونکہ انہوں نے دعوتِ توحید کا انکار

کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں پر مظالم ڈھائے حتی کہ ان کے مقابلہ میں سیف بکف میدان میں آ گئے۔

احباطِ اعمال

آگے چلئے فرمایا ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَرِھُوا مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَھُمْ یہ اضلال اعمال کیوں ہو گا! اس لئے کہ ان کا جرم بہت بڑا ہے۔ انہوں نے اس چیز کو پسند نہیں کیا جسے اللہ نے نازل فرمایا ہے۔ ان کو عداوت در حقیقت اس قرآن سے ہے۔ ان کی ذاتی دشمنی اور رنجش محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نہیں ہے۔ یہ بات سورہ الانعام میں بہت زور دار الفاظ میں آ چکی ہے کہ اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ کیوں غمگین ہوتے ہیں! یہ لوگ آپؐ کو نہیں جھٹلا رہے' یہ تو ہماری آیات کو جھٹلا رہے ہیں: فَاِنَّھُمْ لَا یُکَذِّبُوْنَکَ وَلٰکِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ (اے نبی!) یہ لوگ تمہیں تو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم' یہ مشرک اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں" ..... انہوں نے آپؐ کو تو کبھی جھوٹا نہیں کہا۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے دعوت توحید کے آغاز سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الصادق اور الامین کے خطاب دیئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ حضورؐ کو نام سے نہیں بلکہ ان کے القاب سے پکارتے تھے اور حضورؐ کا ذکر بھی انہی القاب سے کرتے تھے۔ جاء الصادق اور جاء الامین۔ ان کے بدترین لوگوں سے جب تنہائی میں بات کی جاتی تھی کہ کیا تمہارا خیال ہے کہ نعوذ باللہ محمد جھوٹے ہیں! (صلی اللہ علیہ وسلم) تو وہ حضورؐ کی صداقت کا اعتراف کرتے تھے۔

حضورؐ کے' توحید کے اور اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کا قول تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ پھر تم انؐ کی دعوت پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ انؐ کی بات کیوں نہیں مانتے؟ اس نے جواب میں کہا کہ معاملہ یہ ہے کہ قریش کے مختلف خاندانوں کے مابین ایک مسابقت چلی آ رہی ہے۔ ہمارا مقابلہ تھا بنوہاشم سے' ہم ان سے کندھا ملائے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے حجاج کو کھانے کھلائے اور مہمان نوازیاں کیں تو ہم نے بھی اپنے دسترخوان وسیع کر دیئے۔ ہر کام میں ہمارا اور بنوہاشم کا مقابلہ جاری ہے۔ اب اگر ہم ان کے ایک فرد کی نبوت مان لیں تو

ہمیشہ کے لئے ان کے سامنے ہماری گردنیں جھک جائیں گی۔ ہم ہمیشہ کے لئے ان کے تابع ہو جائیں گے۔ یہ ہمیں کسی صورت میں گوارا نہیں ہے۔ تو "GIVE THE DEVIL HIS DUE" کے مطابق ابو جہل کو اس کا کریڈٹ دیجئے کہ اس نے سچ تو بولا۔ اس نے اس طرح یہ بات تو مان لی کہ درحقیقت اس کا تکبّر حق کو قبول کرنے میں مانع ہے۔ یہی تکبّر تھا یہود کا جو ان کے پاؤں کی بیڑی بن گیا ورنہ قرآن مجید کی گواہی ہے کہ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ یہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن کو ایسے پہچانتے ہیں، جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ لیکن تکبّر اُن کے آڑے آگیا۔ یہاں فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ۝ اب یہاں لفظ احباط آگیا فرمایا: "یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل فرمائی ہے" کراہت کا لفظ آپ بھی استعمال کرتے ہیں مکروہ چیز وہ ہے جو طبیعت کو نہ صرف یہ کہ پسند نہ آئے بلکہ اس سے طبیعت میں ایک شدید ناگواری پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے کلام پاک سے کراہت کی ان کفار کو یہ سزا ملی کہ "اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام اعمال حبط کر دیئے"۔ میں پہلے بھی وضاحت کر چکا ہوں کہ حبط کا استعمال نیکی کے اعمال کے ضائع ہونے پر ہوتا ہے۔ انہوں نے جو حجاج کی مہمان نوازیاں کی تھیں، جس کا ذکر سورۂ توبہ میں ہے: اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ۔ "کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھہرالیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روز آخر پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں۔ اللہ کے نزدیک تو یہ (دونوں) برابر نہیں ہیں"۔ اپنے زعم میں یہ مشرکین سمجھتے تھے کہ ہم اس طرح بڑی نیکیاں کما رہے ہیں۔ یہ فی نفسہٖ نیکی کے عمل ہیں ہم نے اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت رد کر دی تو کیا ہوا!..... اگر کوئی آخرت ہے تو یہ نیکیاں ہمارے کام آئیں گی۔ ان کے اس زعم باطل کی تردید کی جارہی ہے کہ ان کا دعوتِ توحید سے انکار اور اس کی مخالفت ایسے سنگین جرائم ہیں کہ ان کے وہ اعمال بھی جن کو وہ بڑی نیکیاں سمجھے بیٹھے ہیں، جن پر ان کو تکیہ ہے وہ سب اس جرم کی پاداش میں اکارت اور برباد کر دیئے گئے۔

امم سابقہ کے انجام سے عبرت

آگے چلئے' فرمایا: اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ "کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں!"

فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔: "تو یہ دیکھتے کہ ان کا کیا انجام ہوا جو ان سے پہلے گزرے تھے" ۔ یہاں بالواسطہ قریش مکہ سے خطاب ہو رہا ہے کہ تمہارے قافلے شمال کی طرف آتے جاتے رہتے ہیں' تو قوم ثمود کے جو کھنڈرات اس راستہ میں پڑتے ہیں' انہیں تم دیکھتے ہو کہ نہیں دیکھتے؟ پہاڑوں میں تراشے ہوئے محلات کے کھنڈرات اور حضرتِ صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا تالاب بھی تمہارے راستہ میں آتے ہیں کہ نہیں آتے!۔ تو کیا تمہیں عبرت حاصل نہیں ہوتی کہ اس قوم کا کیا حشر ہوا جو یہاں آباد تھی!۔ ذرا اوپر جاتے ہو تو ثمود کی وہ اجڑی ہوئی بستیاں جو کبھی خوب آباد تھیں' تمہارے راستہ میں آتی ہیں کہ نہیں؟ کیا تمہیں یاد نہیں آتا کہ یہ قومیں کس جرم کی پاداش میں ہلاکت کے انجام سے دوچار ہوئیں؟۔ پھر اصحابِ مدین کی بستیاں بھی اسی راستہ میں آتی ہیں۔ عرب کے جنوب میں احقاف کا برباد شدہ علاقہ ہے۔ تو ان اجاڑ اور ویران بستیوں کو دیکھ کر بھی تمہیں یہ سبق حاصل نہیں ہوتا کہ کبھی تم سے کہیں زیادہ زور آور اور قوی قومیں دنیا میں آباد رہی ہیں۔ لیکن جب ان قوموں نے اللہ کے رسولوں کا انکار کیا' اللہ کی وحی کو ٹھکرا دیا تو ان قوموں کا کیا حشر ہوا؟ کیا تم ان سے عبرت نہیں پکڑتے اور سبق نہیں لیتے! تو درحقیقت آیت کے اس حصہ میں: اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ میں ان تمام قوموں کی طرف اشارہ ہے جن سے قریش اچھی طرح واقف تھے۔۔۔ نیز ان قوموں کے انجام کا ذکر مکی سورتوں میں تفصیل سے آچکا تھا۔ ان قوموں کو جن عذابوں سے سابقہ پیش آیا انہی کا یہاں بیان ہے آگے فرمایا: دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَلِلْکٰفِرِیْنَ اَمْثَالُهَا "اللہ نے ان کے سارے ساز و سامان کو انہی پر الٹ دیا' ان کی ساری قوت ان ہی پر دے ماری"..... دَمَّرَ کے معنی ہیں تہس نہس کر دینا' ان کافروں کی ہلاکت' بربادی اور تباہی اس صورت میں ہوئی کہ ان کا ساز و سامان انہی پر الٹ دیا گیا۔ انہی کے محلات ان ہی پر پلٹ دیئے گئے۔۔۔ ذرا سوچئے کہ ہمارے اس دور کی یہ جو سو سو منزل

عمارتیں اگر گریں گی، تو انہی انسان کی بنائی ہوئی عمارتوں کے ملبہ میں کتنے ہزاروں انسان ہلاک ہوں آگے فرمایا!..... وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا۔ یہاں کافرین پر جو "لام تعریف" ہے یہ عہد کا لام ہے۔ اس سے مراد ہے کہ تمہارے مقابلہ میں جو کافر ہیں ان کے ساتھ بھی وہی مثالیں پیش آکر رہیں گی۔ ان کا معاملہ مختلف نہیں ہے، ان کو عذاب الٰہی کی پہلی قسط میدانِ بدر میں ملے گی۔ اس کے بعد اور اقساط آنے والی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے لئے وہ صورت بھی آئے گی، جس کا بیان سورہ توبہ میں ہوا ہے کہ ان مشرکین عرب کے لئے قتل عام کا حکم اہل ایمان کو دیا جائے گا۔

اس آخری قسط کا حکم تو ۹ھ میں آئے گا۔ لیکن پہلی قسط ۲ھ میں میدانِ بدر میں آئے گی..... لہٰذا: وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا۔ کا ایک مطلب یہ ہے کہ جس تباہی و بربادی سے سابقہ امم دوچار ہوئیں، وہ اِن کافروں کے لئے بھی مقدّر ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کر رہے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان کافروں کی تباہی و بربادی صرف دنیا کی سزا پر ختم نہیں ہوگی، جیسے پچھلی قوموں کی نہیں ہوئی بلکہ آخرت میں جس طرح ان قوموں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے سابقہ پیش آئے گا، اسی طرح ان کافروں کو بھی یہ سابقہ پیش آکر رہے گا..... واللہ اعلم

اللہ ہی اصل حامی و ناصر ہے

آگے چلئے فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ۔

یہ انجام کیوں ہوا اور کیوں ہو گا؟ قوم نوحؑ کا، قوم لوطؑ کا قوم عاد و ثمود کا، قوم شعیبؑ کا اور آل فرعون کا تو ہو چکا۔ ان کا بھی یہی انجام ہونے والا ہے اس لئے کہ اللہ کافی ہے، پشت پناہ ہے، حامی و ناصر ہے، مدد گار ہے ان کا جو ایمان لائے۔ اور ان کافروں کا حقیقتاً کوئی پشت پناہ نہیں، کوئی حامی نہیں، کوئی مدد گار نہیں۔ یہ سب بے یار و مدد گار ہیں۔ اپنے ساز و سامان پر ہی اترا رہے ہیں۔ جب کہ مسلمانوں کا معاملہ ساز و سامان کا نہیں۔ ان کا مولیٰ، ان کا حامی و ناصر، ان کا پشت پناہ ان کا اللہ ہے، ان کا مالک ہے، ان کا پروردگار ہے۔

اس آیت مبارکہ میں جو الفاظ آئے ہیں' اس کے متعلق تاریخی اعتبار سے ایک واقعہ نوٹ کر لیجئے ـــــ غزوۂ احد میں یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ وہاں مسلمانوں کو وقتی طور پر شکست ہوئی' ستّر صحابہ کرامؓ شہید ہوئے تو حضورؐ اپنے ساتھیوں کو لے کر جبل احد پر چڑھ گئے تھے۔ اس وقت ابو سفیان کفار مکہ کے لشکر کے سپہ سالار تھے۔ وہ دامن احد میں پہنچ گئے۔ ابوسفیان کو پہاڑ پر چڑھنے کی تو ہمت نہ ہوئی انہوں نے دامن کوہ ہی سے نعرہ لگایا۔ ان کا نام ادب سے اس لئے لے رہا ہوں کے بعد میں ایمان لے آئے تھے ۔ ان کا نعرہ تھا: لنا عزّٰی و لا عزّٰی لکم ۔ اے مسلمانو! ہمارے لئے تو عزّٰی دیوی ہے جو ہماری مدد کرتی ہے' تمہارے لئے کوئی عزّٰی نہیں' کوئی دیوی نہیں' کوئی تمہارا پشت پناہ نہیں ۔ جب اس نعرے کی آواز اوپر پہنچی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ تم جواب دو: اللّٰہ مولنا و لا مولی لکم۔ ہمارا مولیٰ اللہ ہے' تمہارا مولیٰ کوئی نہیں۔ تمہارے لئے یہ دیوی' دیوتا سراب ہیں: اِنۡ هِیَ اِلَّاۤ اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ ۔ یہ تو کچھ نام ہیں جو تم نے گھڑ لئے ہیں' جن کو تم پکارتے ہو' ان اسماء کا مُسمّٰی کوئی نہیں ہے' ان کا مصداق کوئی نہیں ہے ۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہ نعرہ لگانے کا حکم فرمایا کہ: اللّٰہ مولنا و لا مولی لکم ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ اسلوب اس آیت مبارکہ سے اخذ فرمایا۔ واللہ اعلم

اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج کی نشست میں جتنے حصہ کا مطالعہ پیش نظر تھا' وہ حصہ اس کے فضل و کرم سے مکمل ہوا۔ چار نشستوں میں اس سورہ مبارکہ کا پہلا رکوع ختم ہوا۔ انشاءاللہ العزیز ہم آئندہ نشست سے دوسرے رکوع کے مطالعہ کا آغاز کریں گے۔

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدّس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی کی حقیقت

خودی کیا ہے

اقبال کی حکمت میں خودی سے مراد وہ شعور ہے جو خود شناس اور خود آگاہ ہو اپنی ذات اور اپنے مقاصد کا احساس یا شعور رکھتا ہو لیکن یہاں شعور کا مطلب ہوش یا تمیز نہیں بلکہ وہ چیز ہے جس کا خاصّہ ہوش یا تمیز رکھنا ہے، یا جس کی وجہ سے ایک انسان تمیز یا ہوش رکھتا ہے۔ انسان میں یہی چیز ہے جو خود شناس یا خود آگاہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو "میں" کہتی ہے۔ اس لیے اقبال اس کو "انا" یا "الیغو" یا "من" بھی کہتا ہے۔ اور پھر یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے انسان زندہ ہے، اور جب مرتا ہے تو یہی وہ چیز ہے جو اس کے جسم سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اس لیے اقبال اس کے لیے "روح" اور "جان" کے الفاظ بھی استعمال کرتا ہے اور اس کو "زندگی" اور "حیات" کے ناموں سے بھی تعبیر کرتا ہے۔

عقل مُدّت سے ہے اس پیچاک میں اُلجھی ہوئی
رُوح کس جوہر سے خاکِ تیرہ کس جوہر سے ہے

ارتباطِ حرف و معنی اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنے خاکستر سے ہے

زندگی بغیر شعور کے نہیں ہوتی لہٰذا ان معنوں میں کہ شعور زندگی ہے ایک خاص سطح کا شعور

حیوان میں بھی موجود ہے۔ لیکن حیوان کا شعور آزاد نہیں بلکہ قدرت کی پیدا کی ہوئی ناقابلِ تغیّر جبلتوں کے ماتحت کام کرتا ہے۔ اس کے برعکس انسان کا شعور جبلتوں سے آزاد ہو کر اور ان کی مخالفت میں بھی عمل کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خود شناس اور خود شعور ہے اور اپنے مقاصد کو جانتا ہے۔ حیوان اپنے شعور کی وجہ سے فقط سوچتا جانتا اور محسوس کرتا ہے لیکن انسان اپنے شعور کی وجہ سے نہ صرف جانتا، سوچتا اور محسوس کرتا ہے بلکہ جب وہ ایسا کرتا ہے تو وہ جانتا بھی ہے کہ وہ جانتا، سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ اس لیے ہم انسان کے شعور کو خود شناس اور خود آگاہ کہتے ہیں۔ اسے شعور نہیں بلکہ خود شناسی، خود شعوری یا خود آگاہی کہنا چاہیئے اقبال اسی کو خودی کہتا ہے۔

خودی کے اوصاف وخواص: خود آگاہی

خود آگاہی خودی کا ایک حیرت انگیز خاصّہ ہے۔ اسی خاصّہ کی وجہ سے کائنات برپا ہے اور انسان کی ساری تگ و دو اور جد و جہد اسی خاصّہ کی وجہ سے ہے۔ اسی کی وجہ سے خودی اپنے آپ کو بغیر آنکھوں کے دیکھتی ہے اور بغیر کانوں کے سنتی ہے بلکہ اپنے آپ کو کسی حس کی مدد کے بغیر براہِ راست پوری طرح سے جانتی ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ مَیں ہوں کیونکہ میں سوچ رہا ہوں، جان رہا ہوں اور خوشی یا غم محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن میری کوئی حس مجھے اپنے آپ کو جاننے میں مدد نہیں دے رہی۔ اگرچہ میں اپنی خودی کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا لیکن اس کے باوجود بغیر ان آنکھوں کے اس طرح سے دیکھ رہا ہوں کہ میرے لیے اپنے آپ کا علم ان چیزوں کے علم سے بدرجہا زیادہ یقینی ہے جن کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں بلکہ میں جن چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جانتا ہوں ان کا جاننا میرے لیے اسی وجہ سے ممکن ہے کہ میں اپنی خودی کو جانتا ہوں کیونکہ ان کا علم وہی ہے جس کو میری خودی جانتی ہے اور میری خودی سے باہر ان کا کوئی علم نہیں، لہٰذا اگر میں اپنی خودی کو نہ جانوں تو دنیا کی کسی چیز کو دیکھنے کے باوجود نہیں جان سکتا۔ اگر دنیا بھر میں کسی چیز کا یقینی علم ہمیں حاصل ہے تو وہ فقط اپنی خودی کا علم ہے۔ ہم اپنی خودی کے علم سے ہی اپنے دوسرے غیر خودی کے علم کو پرکھتے ہیں۔

خودی کا وجود فریب یا وہم نہیں

خارج کی دنیا کے متعلق ہمارا علم قیاسی ہے اور ہمارا قیاس حواس پر مبنی ہوتا ہے۔ حواس کے تاثرات کے بدلنے سے خواہ اس کا کوئی سبب خارج میں ہو یا نہ ہو، ہمارا علم بدل جاتا ہے۔ اس لیے کوئی شخص کائنات کے متعلق تو کہہ سکتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور زمین اور آسمان درحقیقت موجود نہیں ہیں یا ان کی حیثیت ایک ایسے خواب یا وہم سے زیادہ نہیں جو خالق کائنات کی ہستی کے لیے ایک پردہ کا کام دے رہا ہے۔ لیکن کوئی شخص خودی کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ ایک وہم ہے۔ خودی کا وجود محسوس دنیا، خارجی دنیا یا مادّی دنیا کی چیز نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے حواس اور ہمارے قیاسیات اس کو جاننے کا وسیلہ نہیں بنتے۔

فروغِ دانشِ ما از قیاس است
قیاسِ ما ز تقدیرِ حواس است
چو حس دیگر شد ایں عالم دگر شد
سکون و دیر و کیف و کم دگر شد
تو ان گفتن جہانِ رنگ و بُو نیست
زمین و آسمان و کاخ و کو نیست
خودی از کائناتِ رنگ و بُو نیست
حواسِ ما جہانِ ما و او نیست

اگر کوئی کہے کہ ہمیں اپنی خودی کے وجود کا دھوکا یا وہم ہو رہا ہے اور درحقیقت ایسی کوئی چیز موجود نہیں جو اپنے آپ کو "میں" کہہ سکتی ہو تو اس سے ہم پوچھ سکتے ہیں کہ اس دھوکے یا وہم کا علم یا احساس کس کو ہو رہا ہے۔ اگر اس دھوکے یا وہم کا علم یا احساس ایک حقیقت ہے اور خود ایک دھوکا اور وہم نہیں تو وہ چیز کیونکر ایک دھوکا یا وہم ہو سکتی ہے جس کو یہ علم یا احساس ہو رہا ہے اور یہی چیز خودی ہے جو اپنے آپ کو "من" کہتی ہے۔

اگر گوئی کہ "من" وہم و گمان است
نمودش چوں نمودِ این و آن است
بگو با من کہ دارائے گماں کیست
یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست

یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ خارج کی دنیا تو آشکار موجود ہو لیکن اس کے باوجود اس کا وجود مشکوک ہو اور دلیل اور ثبوت چاہتا ہو اور اس کے اسرار و رموز پر کوئی جبرئیل بھی حاوی نہ ہو سکے اور خودی نظروں سے اوجھل ہو اور اس کے باوجود اس کا ہونا یقینی ہو اور ثبوت یا دلیل سے بے نیاز ہو بلکہ تمام دعاوی اور مسائل اور تمام براہین اور دلائل اس کے ہونے پر مبنی ہوں۔ اس سے زیادہ خودی کے حقیقی ہونے کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے لہٰذا خودی حق ہے اور باطل نہیں، وہ موجود ہے اور غیر موجود نہیں اور اس کا وجود بے مقصد اور بے سود نہیں۔

جہان پیدا و محتاج دلیلے
نمی آید بفکرِ جبرئیلے
خودی پنہاں ز حجت بے نیاز است
یکے اندیش و دریاب ایں چہ راز است
خودی را حق بداں باطل مپندار
خودی را کشتِ بے حاصل مپندار

زمان و مکان سے بے نیازی

اس کے باوجود کہ خودی انسان کے جسدِ عنصری میں جاگزیں ہے جو سلسلۂ لیل و نہار کی پابندیوں سے گھرا ہوا ہے وہ خود زمان و مکان کی حدود و قیود سے آزاد ہے۔ کیونکہ وہ اپنے خیال کے ذریعہ سے ادھر ماضی اور مستقبل کی انتہاؤں تک اور اُدھر کائنات کے دور دراز گوشوں تک جہاں روشنی بھی کروڑوں برس میں آتی ہے آنِ واحد میں جا پہنچتی ہے۔

بخاک آلودہ و پاک از مکان است
بہ بندِ روز و شب پاک اززمان است
خیال اندر کفِ خاکے چنان است
کہ سیرش بے مکان و بے زمان است

چونکہ ہم خودی کو کسی حالت میں بھی نہ ان آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان ہاتھوں سے چھو سکتے ہیں اور غیر کی خودی اپنی خودی نہیں ہوتی کہ ہم حواس کی مدد کے بغیر راہِ راست اسے دیکھ سکیں۔ ہم غیر کی خودی کا علم خواہ وہ خودی خدا کی ہو یا انسان کی فقط اس کے مظاہر اور اثرات اور اعمال اور افعال کے مطالعہ سے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔

خُودی ایک نُورانی قوّت یا قوّتِ نُور ہے

خُودی ایک نور ہے لیکن مادّی روشنیوں میں سے کوئی روشنی ایسی نہیں جو اس کی مماثل ہو اور پھر خودی ایک قوّت ہے لیکن مادّی قوتوں میں سے کوئی قوّت ایسی نہیں جس کے ساتھ اس کو شابہت دی جاسکے۔ یہی وہ نورانی قوت یا قوتِ نور ہے جس کا انسان میں اور دنیا کی ہر چیز میں ظہور ہے۔ یہی زندگی ہے۔

وانمودن خویش را خوئے خودیست
خفتہ در ہر ذرہ نیروئے خودیست
نکتۂ نورے کہ نامِ اُو خودیست
در وجودِ ما شرار زندگی است

اقبال کے الفاظ میں خودی "شعور کا وہ روشن نکتہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں اور یہ ایک لازوال حقیقت ہے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے" اور اس کا ایک خاصّہ یہ ہے کہ وہ عمل اور خودنمائی کے لیے بیتاب رہتی ہے۔

قوّتِ خاموش و بیتابِ عمل
از عمل پابند اسباب و علل

مشکلات پر غالب آنے کی خواہش خودی کا خاصہ ہے

لفظ خودی کی اس تشریح سے ظاہر ہے کہ اقبال نے اس لفظ کو استعمال کر کے انگریزی لفظ SELF CONCIOUSNESS یا SELF کا جو مدت سے فلسفہ کی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ فارسی یا اُردو ترجمہ کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ خودی کی اس سادہ اور معروف فلسفیانہ اصطلاح کو سمجھنے میں بالعموم اقبال کے ایسے معتقدین کو بھی دقت پیش آتی ہے جو اس کے بہت قریب رہے ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ خودی کا لفظ اب تک فارسی اور اُردو میں ایک اور معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے یعنی خود پرستی، خود مختاری، خودسری، خودرائی، خودپسندی، خودغرضی، غرور، نخوت اور تکبّر کے معنوں میں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اقبال نے بھی اپنی قوم کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر خودی کی گوناگوں فطری صفات میں سے اس صفت پر خاص زور دیا ہے جس کا ایک پہلو خودنمائی یا حُبّ استیلا یا حُبّ تفوّق (SELF ASSERTION) ہے

زندگانی قوتِ پیداستے
اصل اُو از ذوقِ استیلاستے

اس صفت کی رُو سے خودی ایک مقصد کا تصوّر کرتی ہے پھر اس مقصد کے حصول کیلئے اپنی پوری قوت سعی و کِل صرف کرتی ہے۔ اس عمل سے اُسے اپنے مقصد میں حائل ہونے والی مخالف قوتوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کا یعنی اپنی قوتوں کا اظہار کرتی ہے اور اس خوداظہاری یا "دانمودن خویش" سے اسے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ خودی کی فلسفیانہ اصطلاح روزمرّہ کی زبان میں استعمال ہونے والے لفظ خودی کے ساتھ معنی کا اشتراک رکھتی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اقبال کے نزدیک جذبۂ خودنمائی یا ذوقِ استیلا کے جائز اور ناجائز استعمال میں کوئی خاص خوبی ہے اور اقبال کی تعلیم یہی ہے کہ جس طرح سے ممکن ہو اس جذبہ کا اظہار کیا جائے۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ اس کی وجہ پوری تفصیل کے ساتھ تو آگے چل کر بیان کی جائے گی لیکن یہاں اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے دو گزارشات ضروری ہیں ایک تو یہ کہ خودی کے مقاصد اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی اور صحیح بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی، جدوجہد یا

عمل سے خودی کو مستقل اور مکمل اطمینان (جو اس کی پیہم ترقی اور ترفع کا ضامن ہے) اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب اس کا مقصد اس کی فطرت کے مطابق ہو۔ غلط مقصد کی پیروی سے خودی کو عارضی تسلّی ہو تو ہو لیکن آخر کار اسے بے اطمینانی اور ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی جدوجہد آخر کار خود اُس کے اندرونی فطرتی مقصد کو شکست دے دیتی ہے۔ اور دوسری گزارش یہ ہے کہ عمل یا جدوجہد احساسِ مُدّعا کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور خودی ہر آن کوئی نہ کوئی مدّعا اچھا یا بُرا صحیح یا غلط رکھنے پر مجبور ہے اور لہٰذا ہر وقت عمل یا جدوجہد کرنے پر بھی مجبور ہے۔ غلط مدّعا غلط عمل پیدا کرتا ہے اور صحیح مدعا صحیح عمل پیدا کرتا ہے۔ اقبال صرف اسی عمل کی تلقین کرتا ہے جو خودی کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہو اور لہٰذا صحیح ہو۔ اور اُس کے نزدیک صحیح مدّعا اور لہٰذا صحیح عمل فقط مردِ مومن کا امتیاز ہے۔ گویا اقبال نے جو عملی جدوجہد اور خود نمائی پر زور دیا ہے اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد یا مدّعا کو درست کریں۔ اسی کو وہ یقینِ محکم یا ایمان کہتا ہے اگر مدّعا نقائص سے پاک اور شکوک و شبہات سے آزاد ہو کر درست ہو جائے تو وہ ایک طاقتور عزم اور ارادۂ عمل بن جاتا ہے۔

اقبال کی وضاحت

اقبال نے خود اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ خودی سے اس کی مراد غرور یا تکبّر نہیں چنانچہ اسرارِ خودی کے دیباچہ میں اس نے لکھا ہے۔

"ہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے، اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا یقینِ ذات ہے۔"

قاضی نذیر احمد کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے:

"اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی دونوں کا موضوع یہی مسئلہ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا اگر ان دونوں میں یا کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے جس میں خودی کا مفہوم تکبّر یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجئے۔"

مطلب یہ تھا کہ میں نے اپنی کسی کتاب میں بھی لفظ خودی کو تکبّر یا نخوت کے معنوں میں

استعمال نہیں کیا۔ نیٹشے (NIETZCHE) پر اقبال کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نوٹ اقبال کاذی کے پاس محفوظ ہے۔ اس نوٹ میں لفظ خودی کی تشریح کرتے ہوئے اقبال نے لکھا ہے:

لفظ خودی کو بڑی مشکل سے اور بادلِ نخواستہ چنا گیا ہے ادبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کے اندر بہت سی خامیاں ہیں اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اسے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہمیشہ بُرے معنوں میں ہی استعمال کیا جاتا رہا ہے اور دوسرے الفاظ بھی جو "مَیں" کی مابعد الطبیعاتی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں اتنے ہی ناموزوں ہیں، مثلاً انا، شخص، نفس، انانیت۔

ضرورت دراصل اس بات کی ہے کہ "مَیں" یا "انیغو" کے لیے ایک ایسا لفظ مل جائے جو بے رنگ ہو اور کسی اخلاقی مفہوم کے بغیر ہو، جہاں تک مجھے معلوم ہے فارسی یا اُردو میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں، فارسی لفظ "من" بھی اتنا ہی ناموزوں ہے، تاہم شعر کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے سمجھا کہ لفظِ خودی سب سے زیادہ موزوں ہے۔ فارسی زبان میں کسی قدر اس بات کی شہادت بھی موجود ہے کہ لفظ خودی انیغو کے سادہ مفہوم یعنی "من" کے بے رنگ معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ گویا مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر سے خودی کا لفظ "من" کے اس ناقابلِ بیان احساس کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو ہر فرد انسانی کی بے مثل انفرادیت کی بنیاد ہوتا ہے، مابعد الطبیعاتی طور پر اس لفظ کا کوئی مفہوم ایسے لوگوں کے لیے نہیں جو اس کے اخلاقی مفہوم سے نجات نہیں پا سکتے۔ میں زبورِ عجم میں پہلے کہہ چکا ہوں۔

گرفتم ایں کہ شرابِ خودی بسے تلخ است
بدردِ خویش نگر زہر ما بدرمان کش

(ترجمہ) خودی کی شراب بے شک تلخ ہے لیکن اپنے مرض پر نگاہ رکھو اور اپنی صحت کی خاطر میرے زہر کو پی لو۔

جب میں نفیِ خودی کی مذمت کرتا ہوں تو میرا مطلب اس سے اخلاقی معنوں میں اثبارِ نفس کی مذمت نہیں ہوتا۔ نفیِ خودی کی مذمت سے میں ایسے افعال کی مذمت کرتا ہوں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ "مَیں" کو ایک مابعد الطبیعاتی قوت کی حیثیت سے مٹا دیا جائے۔ کیونکہ اُسے مٹانے

کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اجزا بکھر جائیں، وہ حیات بعد ممات کے قابل نہ رہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اسلامی تصوف کا نصب العین خودی کو مٹانا نہیں۔ اسلامی تصوف میں فنا سے مراد انسانی انیغو کا مٹانا نہیں بلکہ اس کا مکمل طور پر خدا کی ذات کے سپرد کر دینا ہے، اسلامی تصوف کا نصب العین ایک ایسا مقام ہے جو فنا کے مقام سے بھی آگے ہے۔ یعنی مقام بقا جو میرے نقطۂ نظر سے اثباتِ خودی کا بلند ترین مقام ہے، جب میں کہتا ہوں "لعل کی طرح سخت ہو جاؤ" تو میری مراد نیٹشے کی طرح یہ نہیں ہوتی کہ بے رحم اور بے درد ہو جاؤ بلکہ یہ ہوتی ہے کہ خودی کے عناصر کو مجتمع کرو تاکہ وہ بعد از مرگ زندہ رہنے کے لیے فنا کا مقابلہ کر سکے۔

اخلاقی نقطۂ نظر سے لفظ خودی (جیسا کہ اُسے میں نے استعمال کیا ہے) کا مطلب ہے خود اعتمادی، خودداری، اپنی ذات پر بھروسہ، حفاظتِ ذات بلکہ اپنے آپ کو غالب کرنے کی کوشش جبکہ ایسا کرنا زندگی کے مقاصد کے لیے اور صداقت، انصاف اور فرض کے تقاضوں کو پورا کرنے کی قوت کے لیے ضروری ہو، اس قسم کا کردار میرے خیال میں اخلاقی ہے کیونکہ وہ خودی کو اپنے قویٰ کے مجتمع کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس طرح تحلیل اور انتشار کی قوتوں کے خلاف خودی کو سخت کر دیتا ہے۔ عملی طور پر مابعد الطبیعاتی انیغو دو بڑے حقوق کا علم بردار ہے۔ اوّل زندہ رہنے کا حق اور دوئم آزاد رہنے کا حق جیسا کہ خداوندی قانون نے مقرر کیا ہو۔"

خودی ذہنی کیفیتوں کو منظّم کرتی ہے

خودی کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ ہے کہ وہ ہماری ذہنی حالتوں میں وحدت پیدا کرتی ہے۔ اقبال نے لکھا ہے:

خودی ذہنی حالتوں کی ایک وحدت کی صورت میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ ذہنی حالتیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں ہوتیں، وہ ایک دوسرے کو شامل ہوتی ہیں اور حقیقتاً ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ وہ ایک مرکّب کُل کی، جسے ہم ذہن کہتے ہیں، بدلی ہوئی کیفیتوں کے طور پر ہوتی ہیں۔ آپس میں تعلق رکھنے والی ان حالتوں کی وحدت یا یوں کہیے کہ واقعات کی عضویاتی وحدت ایک مخصوص طرز کی وحدت ہوتی ہے۔ یہ ایک مادّی شے کی وحدت

سے بنیادی طور پر مختلف ہوتی ہے، کیونکہ ایک مادّی چیز کے اجزا ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ سکتے ہیں۔ ذہنی وحدت قطعی طور پر بے مثال ہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ میرا فلاں اعتقاد میرے دوسرے اعتقاد کے دائیں یا بائیں طرف پڑا ہے اور نہ ہی یہ کہنا ممکن ہے کہ روضہ تاج محل کے حسن کا احساس جو میرے دل میں ہے آگرہ سے میری دُوری کی نسبت سے بدلتا رہتا ہے۔ میرا گنجائش کا تصور گنجائش کی دنیا میں گنجائش سے متعلق نہیں ہوتا۔ درحقیقت خودی گنجائش کی ایک سے زیادہ دنیاؤں کا تصور کر سکتی ہے۔ بیدار شعور کی گنجائش اور عالم خواب کی گنجائش آپس میں کوئی تعلق نہیں رکھتیں، وہ نہ ایک دوسرے سے مزاحمت کرتی ہیں اور نہ ایک دوسرے پر منطبق ہوتی ہیں۔ جسم کے لیے صرف ایک ہی قسم کی گنجائش ہو سکتی ہے لہٰذا خودی جسم کی طرح گنجائش کی پابند نہیں۔"

خُودی کی تنہائی اور انفرادیت

خودی کا ایک اور اہم وصف اس کی تنہائی ہے جس کی وجہ سے ہر خودی بے چگوں اور بے نظیر ہوتی ہے۔ اقبال خودی کے اس وصف کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

ایک خاص نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک منطقی قضیہ کے تمام بنیادی مفروضات ایک ہی خودی کے اعتقادات میں شامل ہوں۔ اگر میں اس مسئلہ پر یقین رکھوں کہ تمام انسان فانی ہیں اور ایک اور خودی اس مسئلہ پر یقین رکھتی ہو کہ ارسطو ایک انسان ہے تو اس حالت میں کوئی نتیجہ ممکن نہیں ہوتا۔ نتیجہ اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے کہ دونوں مسئلوں پر میں خود یقین کروں۔ پھر کسی خاص چیز کے لیے میری خواہش بنیادی طور پر میری ہی ہوتی ہے۔ اس کی تشفی سے میری ذاتی تسکین ہوتی ہے۔ اگر اتفاقاً تمام نوعِ انسانی ایک ہی چیز کی خواہشمند ہو تو ان سب کی خواہش کی تسکین سے بھی میری خواہش کی تسکین نہیں ہوگی جب تک کہ وہ چیز خود مجھے میسر نہ آئے۔ دندان ساز میرے دانت کے درد کے لیے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کر سکتا ہے لیکن میرے درد کو محسوس نہیں کر سکتا۔ میری راحتیں، میری کلفتیں اور میری خواہشیں فقط میری ہی ہوتی ہیں اور میری ہی مخصوص خودی کے اجزا و عناصر شمار کی جا سکتی ہیں۔ جب میرے لیے

عمل کی ایک سے زیادہ راہیں کھلی ہوئی ہوں تو ان میں سے ایک راہ کو اختیار کرنے کے لیے مجھے ہی محسوس کرنا، فیصلہ کرنا یا انتخاب کرنا پڑتا ہے، خود خدا بھی ظاہری طور پر اور براہ راست میرے لیے یہ کام نہیں کرتا۔ اسی طرح سے آپ کو پہچاننے کے لیے ضروری ہے کہ میں ماضی میں آپ سے متعارف ہو چکا ہوں۔ میرا کسی مقام یا شخص کو پہچان لینا میرے اپنے ماضی کے کسی تجربہ کی بنا پر ہی ہو سکتا ہے اور کسی دوسری خودی کے ماضی کے تجربہ کی بنا پر نہیں ہو سکتا۔ اپنی ذہنی حالتوں کے اس عجیب و غریب باہمی تعلق کو ہم فقط "میں" کے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں نفسیات کا سب سے بڑا عقدہ ہمارے سامنے نمودار ہونے لگتا ہے۔ اس "میں" کی حقیقت کیا ہے۔

(جاری ہے)

بقیہ : حرفِ اوّل

مکمل جائزہ پیش نظر نہیں ہے۔ مقصود محض اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اشاعیہ کی اشاعت ہمارے لئے خود احتسابی کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔

اس موقع پر ویسے تو ان تمام اہلِ قلم حضرات کا شکریہ ہم پر واجب ہے جن کی نگارشات پرچے کی زینت بنتی رہی ہیں لیکن شدید احسان ناشناسی ہوگی اگر مولانا محمد تقی امینی اور مولانا اخلاق حسین قاسمی کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جن کا قلمی تعاون ہمیں مسلسل حاصل رہا ہے اور جن کی مشفقانہ سرپرستی ہمارے لئے باعثِ ہمت افزائی رہی ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں 'ربٰو اور مضاربت' میں فرق کے عنوان سے مولانا محمد طاسین صاحب کا ایک محققانہ مضمون شامل ہے۔ اگرچہ اس سے قبل ۱۹۸۴-۸۵ء میں مولانا موصوف کا ایک مفصل مقالہ اسی موضوع پر 'مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت' کے زیرِ عنوان بالاقساط شائع ہو چکا ہے، لیکن مولانا کا یہ تازہ مضمون اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس میں زیادہ دقیق علمی مباحث سے بچتے ہوئے عام فہم انداز میں مولانا نے نہایت وضاحت سے اس اہم معاملے کو بیان کیا ہے اور اس طرح اس کی افادیت کا دائرہ خواص سے بڑھ کر عوام تک محیط ہو گیا ہے۔

●●

طالبانِ علومِ قرآن کے لئے نویدِ جانفزا

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

نے حال ہی میں قرآن اکیڈمی میں اپنے سلسلہ وار درس کے دوران

عروس القرآن سورۃ الرحمٰن

کا درس مکمل کیا ہے جسے افادہ عام کیلئے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس میں پیش کیا جا رہا ہے

آڈیو کیسٹ ——— چار عدد ہدیہ -/۸۰ روپے

ویڈیو کیسٹ ——— دو عدد ہدیہ -/۴۵۰ روپے

مزید برآں درج ذیل سورتوں کے دروس پر مشتمل کیسٹ (آڈیو) بھی حاضر سٹاک میں دستیاب ہیں

۱ — سورہ الفاتحہ
۲ — سورہ الکہف
۳ — سورہ مریم
۴ — سورہ الاحزاب
۵ — سورہ الفاطر
۶ — سورہ یٰس
۷ — سورہ الصّٰفّٰت
۸ — سورہ صٓ
۹ — سورہ الزمر
۱۰ — سورہ الشوریٰ
۱۱ — سورہ الزخرف
۱۲ — سورہ الدخان
۱۳ — سورہ الجاثیہ
۱۴ — سورہ الاحقاف
۱۵ — سورہ محمد
۱۶ — سورہ الفتح
۱۷ — سورہ الحجرات
۱۸ — سورہ قٓ
۱۹ — سورہ الذّاریات
۲۰ — سورہ الطور
۲۱ — سورہ النّجم
۲۲ — سورہ القمر
۲۳ — سورہ الواقعہ
۲۴ سورہ الحدید
۲۵ — سورہ الصف
۲۶ — سورہ الجمعہ
۲۷ — سورہ المنافقون
۲۸ — سورہ تغابن
۲۹ — سورہ الملک
۳۰ — سورہ القلم
۳۱ — سورہ الحاقہ
۳۲ — سورہ المعارج
۳۳ — سورہ نوح
۳۴ — سورہ المزّمل
۳۵ — سورہ المدّثر
۳۶ — سورہ القیامہ
۳۷ — سورہ الدّھر
۳۸ —
۳۹ —

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن فون ۸۵۲۶۸۳

مولانا محمد طاسین

ربٰو اور مضاربت میں فرق

زیرِ نظر مضمون میں میرا مقصد ' معاملۂ ربٰو اور معاملۂ مضاربت کی شرعی حقیقت وماہیت پر روشنی ڈالنا اور یہ واضح کرنا ہے کہ ان دو معاشی معاملات کے درمیان جو بنیادی فرق واختلاف ہے وہ کیا ہے اور یہ کہ اول الذکر کیوں حرام وناجائز اور ثانی الذکر کیوں حلال وجائز ہے ؟

اس کی ضرورت یہ دیکھ کر محسوس ہوئی کہ آج مسلمان عام طور پر یہ تو جانتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک معاملہ ربٰو وسود حرام وناجائز اور معاملۂ مضاربت حلال اور جائز ہے لیکن اَن پڑھ عوام تو درکنار اُن کے لکھے پڑھے خواص میں بھی ایسے افراد بہت ہی کم ہیں جو اِن دو معاشی معاملات کی شرعی حقیقت وماہیت سے پوری طرح آگاہ اور اس فرق واختلاف سے اچھی طرح واقف وباخبر ہوں جو اِن دو معاشی معاملات کے مابین پایا جاتا اور ایک کو دوسرے سے ممیّز وجدا کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ کہ آج مسلمانوں کے درمیان مضاربت کے نام سے بعض ایسے معاشی معاملات تیزی کے ساتھ رواج پا رہے ہیں اور روز افزوں ترقی پر ہیں جو اپنی حقیقت وماہیت اپنے اثرات ونتائج کے لحاظ سے مضاربت نہیں بلکہ ربٰو ہیں اس سے جہاں مسلمانوں کو دینی وروحانی طور پر نقصان پہنچ رہا ہے وہاں ایک طرح سے اسلام کی بدنامی کا بھی سامان فراہم ہو رہا ہے لہٰذا اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کی خاطر یہ مضمون تحریر کرنا پڑا نیز اس نیت سے بھی کہ اپنی ایک دینی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو جاؤں۔

معاملۂ ربٰو کی حقیقت وماہیت کو نکھارنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلامی فقہ میں ربٰو کی دو قسموں کا ذکر ہے۔ ایک کا نام ربٰو النسیہ اور دوسری قسم کا نام ربٰو الفضل ہے ' پہلی قسم کا تعلق چونکہ معاملۂ قرض سے اور دوسری کا تعلق معاملۂ تجارت اور بیع وشراء سے ہے یعنی ہم جنس اشیاء کے تبادلے سے لہٰذا پہلی قسم کو ربائے قرض اور دوسری کو

ربائے بیع کہا جاتا ہے' اسی طرح پہلی قسم کی ممانعت قرآن مجید میں اور دوسری قسم کی ممانعت حدیثِ نبویؐ میں ہے۔ لہٰذا پہلی قسم کو ربائے قرآن اور دوسری قسم کو ربائے حدیث سے تعبیر کیا گیا ہے نیز اول الذکر ربٰو کو اس وجہ سے کہ ظلم و حق تلفی اس کی حقیقت کا لازمی جزء ہے ربائے حقیقی و جلی سے موسوم اور ثانی الذکر کو اس وجہ سے کہ وہ ربائے حقیقی کا ذریعہ و وسیلہ بنتی ہے ربائے مجازی اور رباء خفی سے موسوم کیا گیا ہے' اس مضمون میں جس ربٰو سے بحث کرنا مقصود ہے وہ ربٰو النسیہ ہے جو عملی شکل میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔

ربٰو النسیہ کی حقیقت' قرض کا وہ معاملہ ہے جس میں ابتداء ہی سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ قرض دار مہلت قرض کے عوض قرض خواہ کو قرض کے اصل مال کے ساتھ کچھ مزید مال بھی ضرور ادا کرے گا جس کی مقدار کا تعین مالِ قرض اور مدتِ قرض کی مقدار کے لحاظ سے ہوتا ہے مثلاً اگر ایک ہزار کے قرض پر ایک ماہ کی مدت میں زیادتی کی مقدار دس روپے ہو تو اسی مدت میں دو ہزار کے قرض پر بیس روپے اور پانچ ہزار پر پچاس روپے ہو جاتی ہو' اسی طرح ایک ماہ میں ایک ہزار پر زیادتی کی شرح اگر دس روپے ہو تو اسی رقم پر دو ماہ میں وہ زیادتی بیس روپے اور دس ماہ کی مدت میں سو روپے ہو جاتی ہو۔ یعنی زیادتی کی مقدار میں کمی بیشی' مال قرض اور مدتِ قرض کی کمی بیشی کے لحاظ سے طے پاتی ہو۔

اور پھر چونکہ ربٰو النسیہ کا معاملہ بنیادی طور پر قرض کا معاملہ ہوتا ہے لہٰذا ربٰو النسیہ کی حقیقت کی معرفت کے لئے قرض کی حقیقت کا جاننا ضروری ہے' قرض دراصل اس معاملے کا نام ہے جس میں ایک فریق اپنا مال دوسرے کی ملکیت میں اس عہد و پیمان کے ساتھ دیتا ہے کہ مقررہ مدت کے بعد وہ اس کو اس کے مال کی مثل ضرور لوٹائے گا' چنانچہ جس مال کی کمیت و کیفیت کے لحاظ سے مثل ممکن نہ ہو شرعاً اس کا قرض جائز نہیں ہوتا' اور چونکہ قرض کا مال قرض دینے والے کی ملکیت سے نکل کر قرض لینے والے کی ملکیت میں منتقل اور داخل ہو جاتا ہے لہٰذا قرض لینے والا اس مال کے اندر اپنی دیگر تمام مملوکہ اشیاء کی طرح ہر مالکانہ تصرف کر سکتا ہے مثلاً اپنے ذاتی صرف میں لا سکتا' کسی کاروبار میں لگا کر اس سے نفع کما سکتا' کسی کو بطور ہدیہ اور صدقہ دے سکتا ہے وغیرہ وغیر' مقترض یعنی قرض دینے والا اس کے کسی تصرف پر کوئی پابندی عائد کرنے کا مجاز نہیں ہوتا۔ اس کو قرض دے دینے کے بعد صرف یہ

حق واختیار حاصل رہتا ہے کہ مقررہ میعاد پر مقروض سے اپنے دیئے ہوئے مال کی مثل کا مطالبہ کرے جو مقروض کے ذمے ہر حال میں واجب الادا ہوتا ہے خواہ وہ اسے اپنے ذاتی مصارف میں لاکر ختم کر چکا ہو' یا کسی کو اس نے صدقہ و ھبہ کے طور پر دے دیا ہو یا کسی ارضی سماوی آفت سے وہ ضائع ہو چکا ہو' بہر صورت اس کے ذمہ پر لازم اور واجب ہوتا ہے کہ وہ مقرض کو اس مال کی مثل ادا کرے اور اگر اصل شکل میں وہ مال موجود ہے تو بعینہ اسے لوٹا دے۔ اگر کسی وجہ سے ادائیگی سے قاصر ہو تو قرض خواہ سے مزید مہلت کی درخواست کر سکتا ہے جس کا قبول کرنا نہ کرنا اس کی مرضی پر منحصر ہے یعنی اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ مزید مہلت دے کیونکہ قرض دینا تبرع اور اخلاقی اور احسانی نوعیت کا معاملہ ہے جو اختیاری ہے۔

معاملۂ قرض کی یہ جو حقیقت وماہیت عرض کی گئی ہے اس کے مطابق مالی لین دین کا ہر وہ معاملہ 'قرض کا معاملہ قرار پاتا ہے جس میں ایک فریق ہمدردی وخیر خواہی کے طور پر تبرعاً اپنا مال دوسرے کی ملکیت میں دیتا اور یہ طے کرتا ہے کہ اتنی مدت کے بعد دوسرا فریق اس کو ایسا ہی مال ضرور بالضرور واپس کرے گا جو کمیت اور کیفیت میں اس کے مال کے برابر ومساوی ہو گا' اور دوسرا فریق اس ذمہ داری کا اظہار کرتا ہے کہ لیا ہوا مال مقررہ وقت پر پہلے فریق کو مثل کی شکل میں ضرور پورے کا پورا ادا کرے گا۔

لہٰذا اگر کوئی اس قسم کے معاملے کو لفظِ قرض کی بجائے کسی اور لفظ سے مثلاً امانت سے موسوم کرتا ہے تو وہ بڑی سنگین غلطی کا مرتکب ہوتا ہے لیکن اس سے اس معاملے کی شرعی حیثیت پر کچھ اثر نہیں پڑتا اور اس کا شرعی حکم قرض ہی کا حکم رہتا ہے نام کی تبدیلی سے اس کی حقیقت وماہیت تبدیل نہیں ہوتی اور نہ اس کے احکام بدلتے ہیں۔

قرض کے اس معاملے کے اندر جب ابتداء ہی میں فریقین کے درمیان یہ طے ہو جائے کہ قرض لینے والا مہلت قرض یا مدّتِ قرض کے عوض قرض دینے والے کو کچھ زائد بھی ضرور ادا کرے گا تو اس سے قرض کا یہ معاملہ ربوالنسیہ کا معاملہ بن جاتا ہے جو شرعاً حرام وممنوع ہے۔ اب اس معاملے کو ربوٰ کی بجائے کوئی دوسرا نام دے دیا جائے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا اور محض نام کی تبدیلی سے اس کی شرعی حیثیت نہیں بدلتی اور وہ حرام کا حرام رہتا ہے کیونکہ

شریعت کے جواز وعدمِ جواز اور حلال وحرام کا تعلق معاملات کی حقیقت وماہیت سے ہے جس پر عملی اثرات مرتب ہوتے اور جس سے خاص طرح کے حالات وجود میں آتے ہیں۔ ان الفاظ اور اسماء سے نہیں جن سے معاملات کو موسوم اور تعبیر کیا جاتا ہے' مثلاً جس چیز کا نام زہر ہے اس کا استعمال اس وجہ سے برا اور ممنوع ہے کہ اس کے کھانے سے ہلاکت واقع ہوتی ہے' ظاہر ہے کہ اس کو زہر کی بجائے قند یا تریاق کہہ دیا جائے تو اس نام کے بدلنے سے اس کی حقیقت نہیں بدلتی اور اس میں قند اور تریاق کی خاصیت پیدا نہیں ہو جاتی' قند سمجھ اور کہہ کر اسے کھایا جائے تو ہلاکت ضرور واقع ہوگی' یا مثلاً خنزیر کا نام بکری رکھ دیا جائے تو اس کا گوشت حلال نہیں ہوگا حرام ہو گا حرام ہی رہے گا' یا سود کو نفع کہہ دیا جائے تو اس کی حرمت' حلت سے تبدیل نہیں ہوگی وہ اپنے برے اثرات ونتائج کی وجہ سے حرام وممنوع ہی رہے گا۔

معاملہ ربوٰ کی حقیقت وماہیت کے بعد اب میں معاملۂ مضاربت کی شرعی حقیقت وماہیت کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں' فقہاء اسلام نے مضاربت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی روشنی میں معاملۂ مضاربت کی حقیقت وماہیت یہ کہ وہ ایک ایسا معاشی معاملہ ہے جس میں ایک فریق کا مال اور دوسرے کا تجارتی کام وعمل ہوتا اور دونوں کے مابین یہ طے پاتا ہے کہ اگر تجارت میں نفع ہو گیا تو دونوں کے درمیان نسبتی حصہ یعنی آدھا آدھا یا ایک تہائی اور دو تہائی یا ایک چوتھائی اور تین چوتھائی کے تناسب سے تقسیم ہو گا' اور یہ کہ اگر کبھی کاروبار بیٹھ گیا اور اصل سرمائے ہی میں خسارہ ونقصان واقع ہو گیا تو وہ تمام تر اور پورے کا پورا' مال والا فریق جسے رب المال کہا جاتا ہے برداشت کرے گا' کام وعمل کرنے والا فریق جسے عامل مضارب کہا جاتا ہے اس مالی نقصان میں بالکل شریک نہ ہو گا' اور یہ کہ عامل مضارب بعض امور میں پابند ہو گا کہ رب المال کی مرضی کے مطابق کام کرے' اور یہ کہ فریقین جب چاہیں معاملہ ختم کر سکتے ہیں' چونکہ اس معاملے میں جو سرمایہ لگا ہوتا ہے وہ مال والے فریق کی ملکیت میں رہتا ہے کام کرنے والے کی ملکیت میں منتقل نہیں ہوتا بلکہ اس کی تحویل میں بطور امانت ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر وہ مال کسی ارضی سماوی آفت سے ضائع ہو جائے تو اس کا تاوان عامل مضارب پر نہیں پڑتا بلکہ سب کا سب رب المال کے کھاتہ میں جاتا ہے کیونکہ امانت کے متعلق شرعی قاعدہ یہی ہے کہ وہ کسی غیر اختیاری سبب کے نتیجہ میں تلف اور ضائع

ہوجائے تو اس شخص پر اس کا ضمان نہیں آتا جس کی حفاظت میں یہ امانت ہوتی ہے' اور پھر یہی وجہ ہے کہ عامل مضارب مالِ مضاربت میں محض اپنی مرضی سے ہر تصرف نہیں کر سکتا بلکہ بعض تصرفات میں اسے رب المال کی مرضی کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے اور اس کی اجازت کے بعد ہی کر سکتا ہے۔

بہرحال چند چیزیں ایسی ہیں جو معاملۂ مضاربت کی ماہیت میں داخل ہیں اور اس کو دوسرے معاملات سے ممیز وجدا کرتی ہیں۔ اوّل یہ کہ اس میں ایک فریق کا صرف مال اور دوسرے فریق کا محض عملِ تجارت ہوتا ہے اور یہ چیز اس کو معاملہ شرکت الاموال سے الگ کر دیتی ہے جس میں ہر فریق کا مال ہونا بھی ضروری ہوتا ہے اور تجارتی کام وعمل بھی لازمی ہوتا ہے' دوم یہ کہ مضاربت میں عامل مضارب کی طرف سے ربُ المال کے لئے نہ یہ ضمانت وذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کا مال جب واپس کرے گا تو پورے کا پورا واپس کرے گا نہ یہ ضمانت وذمہ داری ہوتی ہے کہ اس کو نفع کے نام سے اصل مال پر کچھ فائد بھی ضرور دے گا' یہ چیز مضاربت کو معاملہ ربو سے ممیز وجدا کر دیتی ہے کیونکہ معاملہ ربٰو میں یہ دونوں ضمانتیں موجود ہوتی ہیں یعنی سود پر لیا ہوا اصل مال واپس کرنے کی بھی ضمانت ہوتی ہے اور اصل مال پر کچھ زائد ادا کرنے کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے' تیسری چیز یہ کہ نفع ہونے کی صورت میں مال والے فریق کو مضاربت میں جو نفع ملتا ہے اس کی مقدار کا تعین مال مضاربت کی مقدار اور مدت کی مقدار سے نہیں ہوتا' یعنی یہ نہیں ہوتا کہ مثلاً ایک ہزار پر نفع کی مقدار دس روپے ہو تو دو ہزار پر بیس روپے اور دس ہزار پر سو روپے قرار پائے' یا یہ کہ ایک متعین رقم پر ایک ماہ کے لئے نفع کی جو مقدار ہو اسی رقم پر دو ماہ کے لئے اس کا ڈبل اور چار ماہ کے لئے اس کا ڈبل ہو مثلاً ایک ماہ کی مدت کے لئے جس رقم پر دس روپے مقرر ہوں ایک سال میں اسی رقم پر ایک سو بیس ہو جائیں' مضاربت میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ مثلاً دس ہزار پر ایک ماہ کی مدت میں اتنا نفع مل جاتا ہے جو دوسری دفعہ ایک لاکھ پر ایک سال کے اندر بھی نہیں ملتا' اور بعض دفعہ سرے سے کچھ ملتا ہی نہیں بلکہ اصل میں نقصان واقع ہو جاتا ہے' یہ چیز بھی مضاربت کو معاملہ ربٰو سے علیحدہ کر دیتی ہے کیونکہ ربٰو میں اصل پر جو زیادتی طے پاتی ہے اس کی مقدار کا تعین مال کی مقدار اور مدت کی مقدار سے ہوتا ہے جیسا کے پہلے ربو کے بحث میں عرض کیا گیا' لیکن بڑے

دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ آج کل مضاربت کے نام سے ایسے معاملات رواج دیئے اور چلائے جارہے ہیں جن میں مضاربت کی اس تیسری خصوصیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے یعنی ان کے اندر منافع کی مقدار کا تعین مال کی مقدار اور مدت کی مقدار کے لحاظ سے کیا جاتا ہے جیسا کہ ربوٰ کے معاملے میں ہوتا ہے لہٰذا مضاربت کا معاملہ اس سے ربوٰ کا معاملہ بن جاتا ہے' میں سمجھتا ہوں کچھ لوگ ایسا نادانی اور ناسمجھی سے کر رہے ہیں اور کچھ عیاری و چالاکی سے' بہرحال ایسا کرنے سے وہ معاشی معاملہ مضاربت کا معاملہ نہیں رہتا۔ بلکہ معاملہ ربوٰ کی شکل اختیار کر لیتا ہے لہٰذا اس کا شرعی حکم بدل جاتا ہے بنابریں گزارش ہے کہ مضاربت پر کام کرنے والے مسلمان معاملے کے اس پہلو کا خاص طور پر اور ضرور لحاظ رکھیں۔ چوتھی چیز یہ کہ مضاربت میں لازمی اور ضروری ہے کہ نفع کی صورت میں نفع کی تقسیم فریقین کے درمیان نسبتی حصہ سے ہو یعنی نصف نصف یا ایک تہائی اور دو تہائی یا ایک چوتھائی اور تین چوتھائی وغیرہ سے' چنانچہ اگر مضاربت میں کسی فریق کے لئے نفع کی ایک خاص مقدار متعین کر دی جائے مثلاً نفع میں سے اس کے لئے پانچ سو روپے ہوں گے تو اس سے مضاربت کی نفی ہو جاتی ہے اور اس کا حکم مضاربت کا حکم نہیں رہتا۔ پانچویں چیز یہ کہ جیسا کہ ابھی اوپر عرض کیا گیا کہ مضاربت میں بصورتِ نفع' نفع کی تقسیم مال والے فریق اور اس فریق کے مابین نسبتی حصہ سے ہونا ضروری ہے جس نے تجارت کا کام انجام دیا اور جس کی محنت و مشقت سے نفع وجود میں آیا ہو لہٰذا معاملے کی ایسی صورت معاملۂ مضاربت سے مختلف ہو جاتی ہے جس میں ایک فریق دوسرے سے مضاربت پر مال لیتا لیکن خود اس مال کے ساتھ خرید و فروخت کی تجارت کا کام نہیں کرتا بلکہ ایک منتظم کی حیثیت سے اپنی نگرانی میں دوسروں سے متعین اجرتِ یومیہ یا ماہانہ پر یہ کام کراتا ہے اور پھر جو نفع حاصل ہوتا اسے اپنے اور مال والے فریق کے درمیان طے شدہ نسبتی حصہ سے تقسیم کر لیتا ہے' معاملہ کی یہ صورت مضاربت کی صورت سے اس لئے مختلف ہو جاتی ہے کہ اس میں ان لوگوں کو نفع کا نسبتی حصہ نہیں ملتا جو تجارتی کام کرتے اور جن کی محنت و سعی سے نفع وجود میں آتا ہے۔ بلکہ ان کو ان کے کام کی متعین اجرت ملتی ہے' جہاں تک منتظم کا تعلق ہے وہ بلاشبہ اپنے انتظامی کام کی عرف کے مطابق اجرت لے سکتا ہے لیکن چونکہ وہ حقیقی معنوں میں عامل مضارب نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ تجارت کا اصل کام

نہیں کرتا لہٰذا اس کے لئے نفع کے نسبتی حصہ کا جواز پیدا نہیں ہوتا' نیز اس صورت میں اگر اصل میں نقصان ہو جائے تو اس کا وہ ذمہ دار ہوتا ہے مال والا فریق ذمہ دار نہیں ہوتا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ معاملہ کی وہ صورت جس میں عامل مضارب خرید و فروخت کا اصل کام تو خود کرتا ہے لیکن حمل و نقل اور حفاظت وغیرہ کے کام دوسروں سے نقد اجرت پر لیتا ہے جو حقیقت میں تجارت کے کام نہیں تو ایسی صورت مضاربت ہی کی صورت ہوتی اور اس کا حکم مضاربت ہی کا حکم ہوتا ہے۔ چھٹی چیز یہ کہ مضاربت میں دورانِ معاملہ نفع کی تقسیم جائز نہیں ہوتی بلکہ ضروری ہے کہ اختتامِ معاملہ پر تقسیم ہو کیونکہ بعض دفعہ اچانک ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے کہ درمیان میں جو نفع یقینی نظر آ رہا تھا آخر میں وہ نقصان و خسارے سے بدل جاتا ہے چنانچہ درمیان میں جو نفع تقسیم کیا گیا تھا واپس اصل میں شامل کر دینا پڑتا ہے کیونکہ نفع تو وہ ہوتا ہے جو اصل سرمائے سے زائد ہو جائے۔ ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے بنکوں میں نفع و نقصان میں شرکت کے نام سے معاملہ رائج ہوا ہے اس میں دورانِ معاملہ ہر ششماہی میں منافع کی تقسیم ہوتی اور نفع کا حصہ مال والے فریق کے کھاتے میں جمع کیا جاتا ہے' لیکن چونکہ ہمارے علم و فہم کے مطابق یہ معاملہ نہ شرکتِ اموال کا معاملہ ہے جس میں مال کے ساتھ ہر فریق کا کام و عمل ہونا بھی ضروری ہوتا ہے جو یہاں ایک فریق کی طرف سے بالکل موجود نہیں اور نہ مضاربت کا معاملہ ہے جس میں کام کرنے والا فریق اصل مال کے نقصان میں کبھی شریک نہیں ہوتا' علاوہ ازیں دوسری بھی کئی وجوہ ہیں جو اس معاملہ کے مضاربت ہونے کی نفی کرتی ہیں' بلکہ غور سے دیکھا جائے تو کئی پہلوؤں سے یہ ربوٰ ہی کا معاملہ نظر آتا ہے لہٰذا اس میں اگر دورانِ معاملہ ہر ششماہی میں منافع کی تقسیم ہوتی ہے تو ہوتی رہے اس پر اعتراض کرنا فضول و بے کار ہے۔ ساتویں چیز یہ کہ مال مضاربت کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسی تجارت میں لگایا جائے جو اسلامی اصولِ شریعت کے مطابق ہو' ایسی تجارت میں لگانا جائز نہیں جس میں سود اور جوئے کی امیزش اور جس کا تعلق لازماً بنک اور انشورنس سے قائم ہوتا ہو جیسے آج کل کی درآمدی و برآمدی تجارت جو بنک اور انشورنس کے تعلق کے بغیر ممکن ہی نہیں' نیز اس میں معدوم اور غیر موجود اشیاء کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے جو اسلامی اصولِ تجارت کے خلاف ہے۔ لہٰذا جو اشخاص اور ادارے مسلمانوں سے مضاربت پر مال لے کر کاروبار کے ایسے

طریقوں میں لگاتے ہیں جو شرعاً ناجائز اور ممنوع ہیں نیز بنکوں سے سودی لین دین بھی کرتے اور نفع کمانے میں حلال و حرام کا کچھ لحاظ نہیں رکھتے اُن مسلمانوں کو جو رزق حلال چاہتے ہیں ایسے اشخاص اور اداروں سے مضاربت وغیرہ کے نام سے کوئی مالی لین دین نہیں کرنا چاہئے' رہے وہ لوگ جو حلال و حرام کی کچھ پرواہ نہیں کرتے ان سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔

قارئین کرام! مضاربت کی شرعی حقیقت کے متعلق اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے میں یہ جانتا اور تسلیم کرتا ہوں کہ اس پر کسی ایسے معاشرے میں عمل کرنا بڑا مشکل مسئلہ ہے جس میں سرمایہ دارانہ معاشی نظام قائم اور رائج ہو اور اس کے اندر سرمایہ کاری کی ایسی بکثرت شکلیں پائی جاتی ہوں جن میں اصل سرمائے کے قانونی تحفظ کے ساتھ کچھ زائد ملنے کی بھی پوری ضمانت موجود ہوتی ہے' اور جس معاشرے میں عام طور پر لوگوں کے ذہنوں پر تکاثر یعنی زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے اور بڑے سے بڑا مال دار بننے کا بھوت سوار ہو' خود غرضی اور مفاد پرستی' عمومی صورت میں پائی جاتی ہو' بدقسمتی سے آج ہمارے پاکستانی معاشرے کی صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے اس میں رائج معاشی نظام بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ ہے حکومت کی طرف سے سرمایہ کاری کی ایسی کتنی شکلیں رو بعمل ہیں جن میں اصل سرمایہ بھی بہر حال محفوظ رہتا اور اس پر اضافہ بھی ضرور ملتا ہے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً ایسے قرضوں کا اجراء ہوتا رہتا ہے جن پر مال کی مقدار اور مدت کی مقدار کے لحاظ سے زیادتی کا تعین ہوتا ہے اور بدقسمتی سے اس زیادتی کو سود کی بجائے نفع سے تعبیر کیا جاتا ہے' اسی طرح حکومت کی طرف سے مختلف ناموں سے سرمایہ کاری کے جو سرٹیفکیٹ اور بانڈ جاری کئے جاتے ہیں وہ بھی اسی نوعیت کے ہیں ایک اطلاع کے مطابق ہماری حکومت اپنی پبلک سے لئے ہوئے داخلی قرضوں پر سالانہ تیس ارب روپے بطور سود ادا کرتی ہے نیز سرکاری بنک کھاتہ داروں سے جو مال لیتے اور کاروباری لوگوں کو جو مال دیتے ہیں اس کی قانونی حیثیت قرض کی ہوتی اور مال کی مقدار اور مدت کی مقدار کے لحاظ سے اس پر اضافے کا تعین ہوتا ہے' اس معاملے کو ربٰو کی بجائے شرکت و مضاربت اور اس میں ملنے والے اضافے کو سود کی بجائے نفع کہہ دینے سے حقیقتِ حال پر کچھ اثر نہیں پڑتا اور نہ ہی اس کی نوعیت بدلتی ہے معروضی اثرات و نتائج مذکورہ سب صورتوں میں یکساں رہتے ہیں خواہ ان کے نام اور عنوان کچھ ہی کیوں نہ ہوں غرض یہ کہ

ہمارے پاکستانی معاشرے کی عام طور پر جو ذہنی ' معاشی اور معاشرتی حالت ہے وہ مضاربت جیسے معاملات کے لئے موافق و ساز گار نہیں جن میں نہ اصل سرمائے کے تحفظ اور پورے کا پورا واپس ملنے کی ضمانت موجود ہوتی ہے اور نہ اس پر یقینی منافع کی ذمہ داری ' یہ الگ بات ہے کہ عموماً یہ دونوں چیزیں عملاً موجود رہتی ہیں سرمایہ بھی سرمائے والے کو مل جاتا ہے اور کچھ نہ کچھ نفع بھی ' اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ معاملہ ناپید ہو گیا ہوتا ' لیکن بہرحال اس میں سرمائے والے فریق کو ویسا اطمینان نہیں ہوتا جیسا کہ سرمایہ کاری کی ربوی شکلوں میں ہوتا ہے ' اور چونکہ ہمارے موجودہ معاشرے میں سرمایہ کاری کی بہت سی ربوی شکلیں موجود ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا لہٰذا اس میں مضاربت کے لئے کامیابی کا بہت کم امکان ہے اجتماعی طور پر بڑے پیمانہ سے مضاربت پر کاروبار چلانا خاصا مشکل اور حوصلہ شکن کام ہے الا یہ کہ مضاربت کی شرعی حقیقت کو بدل کر ایسا کر دیا جائے کہ وہ معاملہ ربوٰ کی شکل اختیار کر لے جیسا کہ پاکستان میں رائج مضاربت کے ساتھ کیا گیا اس کی حقیقت و ماہیت میں ایسا تصرف اور ردوبدل کیا گیا ہے کہ وہ اپنی ہیئتِ ترکیبی اور اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے ربوٰ کے مماثل بن کر رہ گئی ہے اور افسوس کہ اس میں اسلام کے چالاک دشمنوں کے ساتھ کچھ نادان دوست بھی شریک ہیں۔

بہرکیف نہائت رنج و دکھ کی بات یہ کہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اسلامی ہونے کا ڈھنڈورہ پیٹا اور زور و شور سے پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے جو دراصل اسلام پر کھلا ہوا ظلم ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ پر افتراء کیونکہ کسی معاملے کو اسلامی کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسے جائز قرار دیا ہے اور چونکہ معاملہ مذکورہ قرآن و حدیث کی رو سے ناجائز ہے لہٰذا اس کو اسلامی کہنا ' اللہ اور اس کے رسول کی طرف غلط بات منسوب کرنا ہے جو بدترین گناہ ہے۔ جس کا ارتکاب ایک مسلمان سے ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ علاوہ ازیں ایک ایسے معاملے کو جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے مضاربت کا نہیں ربوٰ کا معاملہ ہے اسلام کے حوالے سے جائز کہنا ' دشمنان اسلام کے لئے یہ موقع مہیا کرنا ہے کہ وہ بدنام کرنے کے لئے یہ اعتراض کریں کے اسلامی تعلیمات میں تضاد پایا جاتا ہے کیوں کہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے ایک ہی معاملہ اس کے ہاں جائز بھی ہے اور ناجائز بھی ' یعنی جب اس کا نام ربوٰ ہو تو ناجائز اور مضاربت ہو تو جائز تو گویا اسلام حقائق سے زیادہ الفاظ کو اہمیت دیتا ہے اور یہ اس حقیقت

پسندی کے منافی ہے جو ایک صحیح سچے دین میں ہونی چاہئے' خلاصہ یہ کہ زیرِ بحث معاملہ کو جو بلحاظ حقیقت مضاربت کا نہیں ربٰو کا معاملہ ہے جائز اور اسلامی کہنا دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلام کی نیک نامی کو نقصان پہچانا اور اسے بدنام کرنا ہے یہ اس لئے بھی کہ اس سے اسلام اور اسلام کے معاشی نظام کے متعلق غلط تصور قائم ہوتا اور لوگوں کو اس سے نفرت وبیزاری کا موقع ملتا ہے یعنی یہ کہ اگر زیرِ بحث معاملہ اسلام کے نزدیک جائز اور صحیح ہو تو پھر اسلامی معاشی نظام سرمایہ دارانہ معاشی نظام بن کر رہ جاتا اور دنیا میں جو نفرت وبیزاری سرمایہ دارانہ نظام کے متعلق پائی جاتی ہے وہ اسلامی معاشی نظام کے حصے میں بھی آ جاتی اور معاندین کو اس کے خلاف پروپیگنڈے کا غنیمت موقع فراہم ہوتا ہے۔

(جاری ہے)

بقیہ : نقطۂ نظر

مستقبل کو درخشاں ہے۔

یہاں پر میں یہ کہتے ہوئے اپنی بات کو ختم کر دیتا ہوں کہ عصرِ نو رات کے دھندلے ستاروں اور کشتیٔ حق کے سہاروں کو انسانیت کی اس بدقسمتی پر غور کرنا چاہیئے۔ فیوز مبارکباد دیتا ہوں اُن خدا پرستوں کو جو اٹھیں اور بے خدا سائنس کو خدا کے تصور کے ساتھ ملا کر مستقبل کے عالم گیر انقلاب کی قیادت کریں!

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشّے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مِل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیٔ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے

★★★

نقطۂ نظر

ڈاکٹر حافظ محمد مقصود

سائنس کی بے خدائیت میں مغربی سائنس دانوں کی علمی خیانت کا دخل

ایک تنقیدی جائزہ

روزِ آفرینش سے لے کر آج تک انسان دنیا، کائنات اور خود اپنے بارے میں سوچتا اور غور و فکر کرتا رہا ہے کہ وہ کہاں سے آیا؟ کیوں آیا اور بالآخر اُسے کدھر جانا ہے۔ ذوقِ تجسّس اور شوقِ جمال کے اس امتزاج کا اعتراف اقبالؔ نے ان الفاظ میں کیا ہے ؎

کُھلتا نہیں مرے سفرِ زندگی کا راز
سمجھا نہیں تسلسلِ شام و سحر کو میں
حیراں ہے بُوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں،
رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

پھر یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اہلِ یونان نے کائنات کے اسرار و رموز اور فطرت کے اس ناپیدا کنار سمندر میں غوطہ زنی کی ایک مبارک مگر ناتمام کوشش کی تھی لیکن وہ چند پیچیدہ اور مبہم ڈھانچوں اور نامکمل ریاضیاتی نسبتوں کے علاوہ مزید پیش قدمی سے قاصر رہے۔ سائنسی فکر کو مشاہدات اور تجربات سے روشناس کرانے کا سہرا ایک دوسری اور اُبھرتی ہوئی قوم کے سر ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں خطۂ عرب میں پروان چڑھی۔ یہ قوم ایک قادرِ مطلق خدا، ایک عظیم المرتبت رسول اور ایک عجیب و غریب کتاب قرآن مجید پر غیر متزلزل ایمان رکھتی تھی جن کی طرف سے انہیں مختلف پیرایوں میں بار بار یہ پاکیزہ تعلیم دی گئی تھی کہ اگر تم واقعی ایک بلند و بالا ہستی کی پہچان اور معرفت کے پیاسے ہو تو اُنہی کی پیدا کی ہوئی کائنات پر مسلسل غور و فکر کرتے رہو جس سے نہ صرف تمہیں خدائے واحد کی کبریائی اور جلالتِ شان کا سراغ مل جائے گا۔ بلکہ زندگی کی نئی نئی گرہیں خود بخود تمہارے سامنے کھل جائیں گی۔ چونکہ دنیا کے ان پہلے باقاعدہ سائنسدانوں کی سائنس خدا کی ترغیب و تحریص اور تشویق و تحریض سے شروع ہوئی تھی۔ لہٰذا خدا کا تصور ان کا مدار و محور رہا اور یہ اپنے فطری طریقے پر آگے بڑھتی رہی۔ اندلس مسلمان سائنس دانوں کا سب سے بڑا مرکز

تھا اور تشنگانِ علم دور دراز علاقوں سے آکر یہاں کے چشمۂ علم و فضل سے سیراب ہوتے تھے۔ یورپی سائنس جس نے آج سینکڑوں معموں کو روند ڈالا ہے اور ہزاروں حقائق کو بے نقاب کر دیا ہے۔ درحقیقت اندلس کے مسلمان سائنسدانوں ہی کی رہینِ احسان ہے۔ بلکہ اب تو جارج سارٹن اور رابرٹ بریفالٹ کی تحریروں سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح مبرہن ہو چکی ہے کہ سائنس کے پہلے بانی اور موجد مسلمان سائنسدان ہی تھے اور مغربی لٹریچر کا تانا بانا ان ہی کے ہاتھ کا کاتا ہوا ہے۔ رابرٹ بریفالٹ " (Intellectual Development of Europe. VOL. II P: 42) " میں تہذیب یورپ کے اس قبائے راز کو ان الفاظ میں تار تار کر دیتا ہے کہ " مجھے افسوس ہے کہ جن اصولوں نے یورپی لٹریچر کو پیدا کیا، انہیں نظر انداز کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یورپ ذہنی لحاظ سے عربوں کا احسان مند ہے۔ قومی دشمنی اور مذہبی تعصب زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔" اسی طرح Heritage of Islam " P. 313 میں جارج سارٹن لکھتا ہے کہ " انسانیت کا مشن مسلمانوں ہی کے ذریعے مکمل ہوا۔ سب سے بڑا فلسفی الفارابی اور سب سے عظیم ریاضی دان ابوالکامل اور ابراہیم ابنِ سینا مسلمان تھے۔ سب سے بڑا جغرافیہ دان اور قاموس نگار المسعودی مسلمان تھا اور سب سے بڑا مؤرخ الطبری بھی مسلمان تھا"۔۔۔ راجر بیکن، گربرٹ آرک لیک، اور تھامس برن نے انہی اداروں میں تعلیم حاصل کی اور ریمنڈ (Raymond) نے یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر ۱۱۴۰ء میں فرانسیسی بندرگاہ مارسیلز میں سیاروں کی گردش کے بارے میں نقشے اور جدولیں تیار کیں۔ لیکن شومئی قسمت کہ حالات نے یکایک ایک زبردست پلٹا کھایا اور خدا کی محبت سے سرشار دلِ دردمند اور فکرِ ارجمند رکھنے والی، حاملِ خلقِ عظیم اور صاحبِ صدق و یقین یہ عجیب و غریب قوم کسی کافر ادا محبوب کے حُبِ جاہ جیسی غمزۂ خونریز کا شکار ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سے " ظالم جو بہہ رہا ہے وہ تیرا ہی گھر نہ ہو" اور سے " یہ سور پھونک کر تم سو گئے کہاں آخر" کے مصداق اپنے پیچھے آگ کی لپیٹ سے جلے ہوئے اور خاک و خون سے رنگے ہوئے بے ہنگم کھنڈرات چھوڑ کر تہذیب حجازی کا مزار بن کر رہ گئی۔

رو لے اب دل کھول کر اے دیدہ خونابہ بار — وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی! — بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے — بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

غلغلوں سے جن کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

اسی حادثۂ عظمیٰ اور مصیبتِ کبریٰ کے بعد تہذیب و تمدن کی کامرانیاں اور علم و عرفان کی اشرفیاں ان ظالم و جبار اہلِ مذہب کے ہاتھوں لٹیں جو ایک ایسے بے بنیاد مذہب کے پیروکار تھے جسے مشہور راہب سینٹ پال نے اصلِ دینِ عیسیٰؑ کو مسخ کر کے بنایا تھا۔ لیکن نادانی، حماقت اور سادہ لوحی کا بُرا ہو کہ لوگوں نے اسے اصلِ دینِ عیسوی سمجھا۔ حالانکہ سینٹ پال کی اس جدید عیسائیت یا "PAULISM" اور اصلی دینِ عیسیٰؑ کے مابین زمین و آسمان کا فرق تھا۔

ان مذہبی پرستاروں اور سرپرستوں کا بنیادی جاہلانہ اور کورانہ عقیدہ یہی تھا کہ دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دین پاک و صاف ہے اور دنیا ناپاک و نجس۔ سائنس چونکہ دنیا سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا وہ بھی ناپاک ہے اور یوں سائنس کو اپنے مذہبی تصورات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خارج کر دیا۔ ان مردم آزار اور فطرت دشمن پادریوں اور راہبوں نے عقل و فکر پر مکمل پہرے بٹھا دیئے اور اپنے تحریف شدہ مذہب کے اوہام و خرافات کو لوگوں پر ٹھونسنا شروع کر دیا۔ جسے خوشنما بنانے اور اپنی دکان داری چمکانے کے لئے وہ جا بجا خدا اور عیسیٰؑ کے نام بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان پادریوں نے کلیسا کی گدی پر بیٹھ کر تین لاکھ بے گناہ لوگوں کو شدید ترین سزائیں دیں۔ جن میں تیس ہزار افراد کو زندہ جلا دیا گیا ان زندہ جلائے جانے والوں میں مشہور سائنسدان برونو (Brunoe) بھی شامل تھا جس کا سب سے بڑا جرم اور گناہ کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ اسی طرح مشہور عالم طبیعات گیلیلیو (Galileo) کو اس لئے موت کی نیند سُلا دیا گیا کہ وہ سورج کے گرد زمین کی گردش کا بھی قائل تھا۔ اہلِ دانش و بینش سائنسدان اور معاشرے کے دوسرے ذہین و فطین افراد سوالیہ نشان اور مظلوم تماشائی بن کر ارباب کلیسا کے مظالم کی چکی میں نہایت بے دردی کے ساتھ پستے رہے اور ان کے دلوں میں ان کوڑھ مغز جہلائے مذہب اور کورچشم مبلغین کے خلاف غم و غصے کا ایک شدید لاوا پکتا رہا۔ اب ایسے مظلوموں کے سامنے صرف پالزم (Paulism) تو کیا کسی بھی مذہب کا نام آتا تو انہیں اچانک اپنے وہ بے گناہ محققین کہنہ مشق سائنسدان اور منجھے ہوئے فلسفی یاد آجاتے اور ان کی تڑپتی ہوئی لاشیں اُن کی آنکھوں میں پھر جاتیں۔ ساتھ ہی ساتھ مذہبی گروہ کے نام پر ان کی نگاہوں کے سامنے دیو ہیکل جسامتیں، پُرغضب اور منحوس چہرے، چڑھی ہوئی تیوریاں، بل پڑی ہوئی پیشانیاں، تنگ سینے، تاریک دل اور اوہام و خرافات سے لدے ہوئے دماغ آجاتے۔ ظالم اربابِ کلیسا اور حاملینِ عقل و فکر کے مابین یہ خونریز اور ناقابلِ تسخیر کشمکش تادیر جاری رہی جو بالآخر مذہبی کلیسا کی شکست اور مظلوم افراد کی شاندار فتح و کامرانی پہ منتج ہوئی۔

اور یوں ان علم دوست افراد (جن میں سائنسدان، فلسفی اور مفکرین سب شامل تھے) نے ایک ایک ظلم کا انتقام لے کر مذہبی کلیسا پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ ان کے تمام جاہلانہ اور کورانہ تصورات و نظریات کو کوڑے کرکٹ کی طرح ٹھوکر مار کر پھینک دیا گیا۔ اب وہ کلیسا کی ایک ایک فکر کو نکال کر نہایت ہی استحقار و استخفاف کے ساتھ اسے رد کر کے جھٹک دیتے تھے کہ اچانک خدا کا تصور بھی ان کے ہاتھ لگا اور ہاتھ لگتے ہی اِن حکمت و معقولات کے دعویدار سائنسدانوں سے ایک فاش اور دردناک غلطی صادر ہوئی۔ سائنس کی نیام کے اندر اللہ تعالےٰ کے تصور اور عشق و جنوں کی شکل میں جو تیغِ جگر دار پہلے ہی سے چلی آ رہی تھی ان عجلت پسند سائنسدانوں نے اچانک اڑالی اور یہ نیام آج تک خالی پڑی ہوئی ہے۔ سائنسدانوں کی اس فاش غلطی پر بیسویں صدی کا اقبالؔ ان الفاظ میں خون کے آنسو رویا۔

؎ عشق کی تیغِ جگر دار اڑالی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

انہوں نے مذہبی تعصب کی آگ میں جل کر اور خدا کے تصور کو کلیسا کی جاگیر سمجھ کر اسے بھی حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ گو کہ اس کا برملا اظہار انہوں نے نہیں کیا اور ایک بے بنیاد نظریہ گھڑ کر خدا کے تصور سے پیچھا چھڑانے کے لئے اسے سائنس کی درسی کتابوں میں شامل کر دیا گیا۔ جو آج تک ان کتابوں میں نہایت ہی فخر کے ساتھ پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے۔ اور اعلان کیا ہے کہ سچائی اور صداقت صرف وہی ہے جسے ہم براہ راست اپنے حواسِ خمسہ سے دریافت کر سکیں۔ جو چیز یا صداقت حواسِ خمسہ کی گرفت میں نہیں آتی وہ یا تو موجود ہی نہیں یا اگر ہے تو ہم اسے نہیں جان سکتے۔ اسی نظریئے کو حسّی صداقت کا نظریہ کہتے ہیں جس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ خدا کا تصور جو پہلے سائنس میں موجود ہی نہیں سائنس کا مدار و محور بھی تھا اب من مانی تاویلوں کے ذریعے سائنس سے خارج کر دیا جائے۔

کیا حسّی صداقت کا نظریہ حقیقت پر مبنی ہے! تاریخ گواہ ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ حسّی صداقت کا نظریہ کسی خداداد عقل، کسی نُدرتِ فکر یا کسی وسعتِ علم کا کرشمہ نہیں بلکہ سینٹ پال کی گھڑی ہوئی نام نہاد شریعت، Paulism، اور سائنس دانوں کی کشمکش کا نتیجہ تھا۔ اگر یہ حسّی مفروضہ صحیح ہے تو ہم اسے سچائی اور صداقت ہرگز نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ بہرحال ایک مفروضہ ہے۔ جسے کسی سائنسدان نے سائنسی طریقوں یا براہِ راست حواسِ خمسہ سے دریافت نہیں کیا بلکہ ایک سوچ یا اختراع ہے۔ مغربی سائنسدان اس مفروضہ سے یہ خلاصہ نکالتے ہیں کہ سائنس کو کسی ایسے عقیدہ سے شروع نہیں ہونا چاہیئے جو براہِ راست حواسِ خمسہ سے ثابت اور دریافت شدہ نہ ہو۔

لیکن ان کا یہ انوکھا اور نرالا اصول بجائے خود ایک عقیدہ یا خیال ہے جو حواسِ خمسہ سے ثابت شدہ نہیں کیونکہ جب ایک مغربی سائنسدان کسی سائنسی عمل کو شروع کرتا ہے تو وہ صرف عمل نہیں ہوتا بلکہ عمل کے وجود یا ظہور سے پہلے اس عمل کے بارے میں ایک خیال یا عقیدہ اُن کے دماغ میں موجود ہوتا ہے ۔ اور عقیدہ کے بعد سائنسی عمل وقوع پذیر ہوتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ سائنس دان کے ذہن میں جو چیز پہلے وجود یا ظہور میں آتی ہے وہ عقیدہ ہے ۔ اور جو چیز عقیدہ کے بطن سے بعد میں پیدا ہوتی ہے وہ سائنسی عمل ہے ۔ لیکن عقیدہ جس نے سائنسی عمل کو ممکن بنایا بجائے خود حواسِ خمسہ سے ثابت شدہ نہیں ۔ لہٰذا مغربی سائنسدان اسے تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں اور جب انہوں نے عقیدے کی نفی کی تو عقیدے سے پیدا ہونے والا سائنسی عمل بھی ناممکن اور بے بنیاد ہو کر رہ جائے گا ۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جب مغربی سائنسدان اپنی سائنس کو اس عقیدہ سے شروع کرتا ہے کہ سائنسی عمل کو کسی عقیدہ سے شروع نہیں ہونا چاہیئے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی تردید اور مخالفت خود کرتا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود مغربی سائنسدان اس بات پر مجبور ہے کہ سائنسی عمل کا آغاز ایک ایسے عقیدہ ہی سے کرے جو براہِ راست حواسِ خمسہ سے ثابت شدہ نہیں ۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان فطرتاً محبت و موانست کا ایک جذبہ اور اظہار ہے اور محبت کسی چیز کے حسین و جمیل ہونے کے عقیدے کا دوسرا نام ہے ۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کا کوئی عمل ایسا بھی ہو جس سے پہلے ایک عقیدہ موجود نہ ہو ۔ سائنسی عمل بھی چونکہ ایک انسانی فعل ہے لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ مغرب کا سائنسدان عقیدہ کے بغیر سائنسی عمل کا آغاز کر سکے ۔

یہاں پر سوال کرنے والا سوال کر سکتا ہے کہ اگر حسی صداقت کا یہ نظریہ بجائے خود سائنسی طریقوں سے ثابت شدہ نہیں تو پھر اس کی علمی اور عقلی دلیل کیا ہے ؟ نہایت افسوس کی بات تو یہی ہے کہ اسکی علمی اور عقلی بنیاد کوئی نہیں بلکہ درحقیقت یہ ایک سازش اور گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھا جس کا مقصد سائنس کو اسی راستے سے بچانا تھا جو اللہ تعالےٰ کے تصوّر کی طرف جاتا ہے ۔ صرف یہی نہیں بلکہ پھر بعد میں ، خدا ناشناس فلسفیوں نے جب بے خدا ذہنیت کے ساتھ خدا ناآشنا فلسفوں کو رواج دیا اور فطرتِ انسانی کی روحانی اور آفاقی نصب العین کی گمراہ کُن توضیحات پیش کی گئیں ، جب سگمنڈ فرائڈ نے غلطی سے اس کی جنسی تعبیر کر ڈالی ۔ جب ایڈلر نے نادانی اور حماقت سے اسے قوت یا غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کا جذبہ قرار دیا ، جسے میکڈوگل نے دھوکہ کھا کر انسان کی حیوانی خواہشات کے ایک پُراسرار مرکب کا جذبہ سمجھا ، جبکہ ڈارون نے اسے قدرت کی بے مقصد کارروائیوں کا نام دیا اور جب کہ

کارل مارکس نے اسے بغیر کسی محکم دلیل کے، انسان کی اقتصادی ضروریات کی ایک بگڑی ہوئی شکل فرض کر لیا ـــــ تو رفتہ رفتہ لوگ بھی اُن تاریخی صداقتوں کو بھول گئے اور انہوں نے یقین کر لیا کہ گویا کائنات کا پیدا کرنے والا کوئی خدا نہیں اور یہ سارا کارخانہ یونہی خود بخود چل رہا ہے۔

سچائی اور صداقت صرف وہی نہیں جسے ہم براہِ راست حواسِ خمسہ سے دریافت کر سکیں۔ بلکہ وہ بھی ہے جسے ہم براہِ راست مشاہدہ سے تو معلوم نہ کر سکیں لیکن کائنات کے اندر اس کے آثار ونتائج کو براہِ راست مشاہدہ سے معلوم کر سکیں۔ مثال کے طور پر ایٹم ہی کو لیجئے۔ ہیروشیما کی تباہی تک ایٹم کو کسی سائنسدان نے خوردبین سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود ایٹم کے آثار اور نتائج کو دیکھ کر تمام سائنسدان اس کے اوصاف اور خصوصیات کا یقین کرتے تھے۔ خدا کو بھی ہم براہِ راست نہیں دیکھ سکتے لیکن کائنات کے اندر اس کے ظاہر و آشکار آثار ونتائج کو دیکھ کر ہم اس کے وجود کا یقین کرتے ہیں۔ اگر مغرب کے سائنسدان ایٹم اور ایکس ریز کے آثار ونتائج کی بنا پر اسے سائنسی حقیقت سمجھتے ہیں تو یہ کون سی شتر گربگی ہے کہ کائنات میں خدا کے آثار ونتائج کی بنا پر خدا کو ایک سائنسی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ حسی صداقت کا وہی بے بنیاد مفروضہ، کلیسا کی وہی دیرینہ دشمنی اور خدا کے تصور سے وہی پرانا ڈر ہے جسے کلیسا کی جہالت اور سائنسدانوں کی علمی خیانت نے جنم دیا تھا۔ ایک سائنسدان قدرت کا مطالعہ اور مشاہدہ کر کے جب اس کے اندر نظم (ORDER) دریافت کرتا ہے تو اس کی یہ تحقیق خود بخود اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا کرتی ہے کہ یہ سب کچھ کون سے ذہن کی پیداوار ہے؟ جس نے کائنات کے اندر باقاعدگی، مقصدیت، تسلسل، کمال اور جمال جیسی خوبیوں کو پیدا کیا ہے۔ اس سوال کا علمی اور عقلی جواب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہی کہ ایک ایسی قادرِ مطلق ہستی ضرور موجود ہے جس کی عظمت و کبریائی کے راگ کائنات کے گوشے گوشے میں چار و ناچار الاپے جا رہے ہیں اور جس کے جلال و جمال کی جھلکیاں ذرّے ذرّے میں عیاں ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایک سی حالات کے تحت اُس خالقِ کائنات کا پیدا کردہ نظم (ORDER) ہر جگہ یکساں ہے۔ مثلاً تنفس۔ انجذاب اور انہضام کا عمل سارے انسانوں کے اندر ایک ہی طریقے سے تکمیل پاتا ہے۔ کششِ ثقل کا عمل جہاں بھی ہوتا ہے ایک ہی قاعدے کا پابند ہے۔ دنیا کے ایک کونے میں اگر انسانی ذہن سوچنے کا کام کرتا ہے تو یہ بات خالقِ ارض و سماء کی پیدا کردہ نظم کے خلاف ہے۔ کہ کسی دوسرے کونے میں وہی ذہن کھانے پینے یا ہنسنے اور کھیلنے کا کام سرانجام دے۔ بلکہ یہ ذہن سوچنے ہی کا کام کرے گا۔ اور پھر جب یہ کائناتی نظم ہر جگہ ایک ہی ہے تو لازماً تسلیم کرنا پڑے گا اور

علم و عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ خالق کائنات دو تین یا چار نہیں بلکہ صرف اور صرف ایک ہی ہو لیکن افسوس ہے کہ مغربی سائنسدان کو یہ ظاہر و آشکار حقیقت باور کرانے کے لئے کہاں سے دماغ لائے جائیں ؟ ذرا دیکھو تو سہی علم و عقل پر پردہ ڈالنے والے ایسے سائنسدانوں اور فلسفیوں کا قرآن نے اس انداز میں تعاقب کیا ہے کہ :

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ (سورۂ یوسف : آیت : ۱۰۵)

اور زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر یہ لوگ بغیر توجہ دیئے ہوئے جان بوجھ کر گزر جاتے ہیں ۔

پھر جب ایک مغربی سائنسدان سائنس کی درسی کتاب لکھنے بیٹھتا ہے اور فارمولے اور کلیات کو ثبت قرطاس کر کے دوبارہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جسے اقبال مرحوم جوشِ جنوں اور سوزِ دُرون کے ساتھ مقامِ فکر اور ذکر سے تعبیر کرتا ہے تو نظم اور آرڈر کے حوالے سے ایک بار پھر اس کے ذہن میں یہ سوال آجاتا ہے اور غیر شعوری طور پر سوز و مستی اور جذب و شوق کا ایک سیلاب اس کے اندر ہی اندر ٹھاٹھیں مارنا شروع کر دیتا ہے کہ بتاؤ تو سہی یہ کونسا ذہن ہے اور یہ کس کی گل کاری ہے جو کائنات کے ذرّے ذرّے میں آشکار ہے ؟ لیکن مغرب کا سائنسدان جستجوئے حق کے بجائے چور دروازوں کی تلاش میں لگ جاتا ہے ۔ جوں جوں یہ سوال آگے آتا ہے مغرب کا سائنسدان اتنا ہی پیچھے جاتا ہے اور ہر ممکن طریقے سے اس سوال سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کا جواب اس کی درسی کتاب میں نہ آنے پائے ۔ وہ یا تو اس سوال کا نوٹس ہی نہیں لیتا یا اگر لیتا ہے تو بعض سائنسدان اور فلسفی بہت دور کی کوڑیاں لاکر اصل تصوّرِ خدا کی جگہ چند دوسرے تصوّرات کو رکھ دیتے ہیں ۔ مثلاً برگساں اسے کسی "قوتِ حیات" کا نام دیتا ہے ۔ جیمز جینز اسے " ریاضیاتی ذہن " سمجھتا ہے اور ڈریش کسی "عالمی سکیم" یا " انٹی لیچی " کا راگ الاپتا ہے ۔ لیکن ایسے لنگڑے اور لولے تصوّرات تعصب اور خیانت کی دنیا میں تریاق اور آبِ حیات ہوں تو ہوں علم اور عقل کی فضا میں پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے ۔

صرف یہی نہیں بلکہ جب دنیائے مغرب نے اہلِ مشرق کو بھی اپنے غلامی کے پنجۂ استبداد میں کس لیا تو قلب و نظر کی رنجوری نے یہاں کی فضا کو بھی مسموم کر کے رکھ دیا ۔ مشرق کے پرانے مٹکے اور مغرب کے بلّوری کنٹر نے اہلِ مشرق کو احساسِ کمتری کے ایک ایسے روگ میں مبتلا کر دیا کہ انہوں نے بھی حسّی اسداقت کا بے بنیاد مفروضہ جوں کا توں لے کر اپنی کتابوں میں شامل کر دیا اور ایک ایسے

نام نہاد مسلمان معاشرے کو فروغ دیا جس میں شرم وحیا سے عاری اور بے خدا گلوکار، اداکار، فنکار اور موسیقار تو سینکڑوں پیدا ہوئے لیکن خدائے واحد کا پجاری اور دنیا کو سنوارنے والا جگت سدھار چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی مل نہ سکا۔

لہٰذا سائنس کا بے خدا ہونا کوئی معمولی اور بے ضرر سی تبدیلی نہیں جو صرف کتابوں، مقالوں اور رسالوں ہی کے اندر رہی۔ بلکہ اسی حادثۂ فاجعہ نے کتابوں سے بڑھ کر ایک بے خدا ذہنیت رکھنے والی انسانیت کو جنم دیا۔ انسان اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ جو کچھ سوچتا ہے اس کے اعضاء و جوارح سے وہی کچھ سرزد ہوتا ہے۔ اس کے خیالات اور نظریات بے خدا ہوں تو اس کے اعمال کا بے خدا ہونا ضروری ہے۔ اسی کی وجہ سے اب کوئی ایسی وسیع اور ہمہ گیر اخلاقی اور روحانی قوت دنیا میں باقی نہیں رہی جو انسانی ضمیروں کے اندر پولیس چوکیاں بن کر اندر سے اُن کے اعمال کو ضبط میں لا سکے۔ یہی واقعہ ہے جو دورِ حاضر کی تمام سیہ کاریوں اور فتنہ سامانیوں کا واحد سبب ہے۔ مثلاً عظیم جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ انسانی گوشت نوچنے والی جدید ہتھیاروں کے بڑھتے ہوئے انبار، عیّار سیاست کاروں اور نادان فلسفیوں کے جھوٹ اور فریب، سیاسی انقلابات اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والے خفیہ قتل اور وارداتیں، سڑکوں اور شاہراہوں پہ پھسلتی، گھسٹتی اور ایڑیاں رگڑتی ہوئی بے گناہ انسانی لاشوں کی بھرمار، جہازوں سے گرتے ہوئے بم اور توپوں، ٹینکوں اور بندوقوں سے زہر آلود گولیوں کی نکلتی ہوئی باڑیں، دولت کی فراوانی کے باوجود اطمینانِ قلب کا فقدان، جنسی بیماریوں، خودکشیوں اور سنگین جرائم میں مبتلا انسانوں کا طومار اور ہسپتالوں، دواخانوں اور شفاخانوں کے اندر ایسے ذہنی اور جسمانی مریضوں کا دھکم پیل اور جمِ غفیر دھاڑ، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اندر طلباء کی بے راہ روی اور بے مقصدیت پہ مبنی اشتغال، مہذب ممالک کا ایک دوسرے کے ساتھ معاملات میں فریب، دھوکہ دہی اور چالبازی کا استعمال، اور بے سروپا اور غلط پروپیگنڈوں کا اچھلتا ہوا طوفان، بڑی بڑی عدالتوں میں جھوٹ، بے انصافی اور چوربازاری کا بڑھتا ہوا رجحان، نوجوانوں کے اندر ذہنی بے سکونی کی بدولت اخلاق سوز حیوانی اور نفسانی ہیجانات، فوجی جیلوں کے اندر بے گناہ انسانوں پر ڈھائے ہوئے لرزہ خیز مظالم اور ان پر تھوپے ہوئے بے بنیاد الزامات، اسمبلیوں، ایوانوں اور پارلیمنٹ ہاؤس کے اندر انسانی شکل میں متشکل اور انسانی کپڑوں میں ملبوس خونخوار درندوں اور بھوکے بھیڑیوں کی پیدا کردہ انتشار، سرخیوں، پاؤڈروں اور آئینوں کے ذریعے ظاہری بناؤ سنگار، جبکہ اندر ہی اندر بھلائی، اخلاق، شرافت اور انسانیت کا انحطاط، سیاسی حریفوں

کے اغوار کی سینکڑوں وارداتیں اور ان پر کئے گئے بے پناہ ظلم و تشدد کے روح فرسا واقعات ، علم کتاب اور استاد کے احترام کا زوال اور علمی درسگاہوں کے نظم و نسق کا بگاڑ۔ فحاشی و عریانی اور بدنی خواہشات کو ابھارنے والی فلموں اور سینما گھروں کے بچھے ہوئے جال۔ مادہ پرست تہذیب کے دلدادہ بیٹوں کے ہاتھوں سکتے ہوئے بدقسمت والدین کا اپنے گھروں سے اخراج اور روح و بدن کے اس فیصلہ کن معرکے میں تہذیبی درندوں کی یلغار وغیرہ وغیرہ

ے دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

عزیز ساتھیو! آپ نے دیکھ لیا کہ حیّت زدہ تہذیب کی گاڑی کتنی سُرعت اور تیز رفتاری کیساتھ قلابازیاں کھاتی ہوئی عظیم بلندیوں سے اتھاہ گہرائیوں کی جانب لڑھک رہی ہے۔ ایک ایسے نازک وقت میں اگر اس کے چلانے والے نادان فلسفیوں اور بے خدا سائنسدانوں کو بالجبر روکا نہیں گیا تو مسافر تو پھر بھی مسافر ہیں گاڑی کے ٹھوس پُرزے بھی ریزہ ریزہ ہونے سے بچ نہیں سکتے۔ بلکہ اب تو ے " تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں " کے مصداق اس کی تیاری سپر پاورز کے ایٹم بموں کی شکل میں ' اور مستقبل قریب میں چند دوسرے بموں کی شکل میں دیکھتی آنکھیں دیکھ لیں گی محترم دوستو! میں صاف صاف کہتا ہوں کہ انسانیت کے لئے بھلائی کے دور دور تک بھی آثار نہیں بھلائی اگر ہوگی تو اُن بے غرض اور قرآن و سنّت کے علم و عمل سے مزین نوجوانوں کے ہاتھوں ہوگی جو آج اللہ تعالےٰ کے حضور گڑگڑا کر اپنے گناہوں سے توبہ اور استغفار کی منادی لے کر اُٹھ کھڑے ہوں جو انسانیت کو عالمگیر اصولوں کی حامل اور خدا کے تصور پر مبنی فلسفہ پڑھائے اور فطرت کا مطالعہ کرتے ہوئے فکر و استدلال کی ان درمیانی کڑیوں کو نظر انداز نہ کر دے جنہیں نظر انداز کرتے ہوئے مغربی اہل نظر ایک جبلّی ضد ایک پرانی چڑ اور ایک دیرینہ تعصب میں مبتلا ہیں۔

عزیز دوستو! آپ میرا نقطۂ نظر سمجھنے میں غلطی نہ کریں۔ میری مراد چند واعظوں کی تیاری نہیں جو کتاب اللہ کی چند چھوٹی موٹی آیات رٹ کر دیہات میں محض وعظ و نصیحت کر سکے۔ نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر سے ایسے باہمّت ' باحوصلہ اور خدا پرست نوجوان اٹھ کھڑے ہوں جو حکمتِ قرآنی کے محکم اساسات اور اسلام کے عالمگیر فلسفے کو پورے استدلال کے ساتھ آکسفورڈ اور کیمبرج میں بھی پیش کر سکیں۔

پیارے دوستو! میں پھر کہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ نے نہ صرف تمہیں جوانی کی قوتوں سے نوازا

ہے بلکہ تمہیں کریم آف دی نیشن بھی بنایا ہے۔ کل اگر خدا کی عدالت میں پوچھا گیا کہ جب روحانیت اور فحاشیت کے مابین ایک طویل رسّہ کشی، ایک خوں ریز کشمکش اور ایک فیصلہ کن معرکہ برپا تھا اس وقت تمہارا وزن کس پلڑے میں جاکر گر رہا تھا؟ روحانیت کے پلڑے میں یا فی الواقع فحاشیت کے پلڑے میں؟ کیا جب بے خدا فلسفی اور سائنسدان نادانی سے آئندہ نسلوں کی تباہی اور بربادی کا سامان کر رہے تھے تو پُرتشنب ہونے کی بجائے تمہارے چہروں پر شرمیلی مسکراہٹیں ہی آتی رہیں۔ جب گمراہی اور ضلالت کے فلسفے انسانیت کی سربراہی کر رہے تھے تو تم صرف جیب اور پیٹ کے شغلوں اور ہمہموں میں مستغرق ہوکر خاموش تماشائیوں کی طرح تماشا ہی کرتے رہے؟ جب تمہارے سامنے خدائیت اور روحانیت کا خون ہو رہا تھا تو تم اس کا راستہ روکنے کی بجائے تالیاں ہی پیٹتے رہے۔ اور جب درندگی کی علمبردار قوتیں مسلح ہوکر جنگ کے میدان میں اتر چکی تھیں تو تم کھیل کے خالی میدانوں میں تن کر کمزوروں کو ہی اپنا بانکپن دکھاتے رہے؛

پس مستقبل کا عالمگیر انقلاب اور انسانیت کا نجات دہندہ سائنس اور خدا کے تصوّر کے ملاپ ہی سے ممکن ہے۔ اسی ضمن میں نامور مفکر پٹی رم سارو کن (Pitirim Sorokin) جو امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں سوشیالوجی کے پروفیسر بھی رہ چکے ہیں، اپنی کتاب The crises of our age میں لکھتا ہے:

> "مذہب اور سائنس کی موجودہ تفریق حد درجہ تباہ کن ہی نہیں بلکہ غیر ضروری بھی ہے۔ اگر سچی صداقت اور سچّی نیکی کے معقول اور تسلی بخش نظریہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو مذہب اور سائنس دونوں ایک ہی ہیں اور ایک ہی مقصد پورا کرتے ہیں۔ وہ مقصد یہ ہے کہ قادرِ مطلق خدا کی صفات کو اس مرئی دنیا کے اندر ظاہر کیا جائے تاکہ خدا کے نام کا بول بالا ہو اور انسان کی عظمت پایۂ ثبوت کو پہنچے"۔

ایک دوسرے فلسفی فیلڈ مارشل سمٹس نے "ہولزم" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جسمیں وہ لکھتا ہے:

> "یہ کہنا قرینِ انصاف ہوگا کہ سائنس ہمارے اس زمانہ کے لوگوں کے لئے شاید خدا کی ہستی کا سب سے بڑا انکشاف ہے۔ یقیناً مستقبل میں نوعِ انسانی کے لئے کرنے کے بڑے بڑے کاموں میں سے ایک یہ ہوگا کہ وہ سائنس کو اخلاقی قدروں کے ساتھ جوڑے اور اس طرح اس مہیب خطرے کا سدِّباب کرے جو ہماری تہذیب کے

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

تذکیر و موعظت

لطف الرحمن خان

علمِ دین کا حصول وقت کی اہم ضرورت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جب اسلام میں کچھ باقی نہ بچے گا سوائے اس کے نام کے اور قرآن میں کچھ باقی نہ بچے گا سوائے اُس کے رسم الخط کے اُن کی مساجد آباد ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی۔ اُن کے علماء آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہونگے اُن کے پاس سے فتنہ نکلے گا اور انہیں میں لوٹ آئے گا۔ (مشکوٰۃ، باب العلم۔ راوی حضرت علیؓ)

آیئے اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھیں۔ پاکستان میں اقتدار حاصل کرنے یا کسی کو اقتدار سے محروم کرنے کے لئے اسلام کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ لیکن اسلام کے نام پر اقتدار حاصل کرنے والے اسلام کو بالفعل نافذ کرنے سے اس لئے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ اقتدار سے محروم نہ ہو جائیں۔ کوئی جمعہ کی چھٹی کا اعلان کر کے اور کوئی صلوٰۃ کمیٹیاں قائم کر کے سمجھتا ہے کہ اس نے اسلام کا حق ادا کر دیا۔ انفرادی سطح پر نماز روزے کا اہتمام کر کے ہم اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم بڑے مسلمان ہیں۔

عام مسلمانوں میں آج بھی ایسے خوش نصیب معقول تعداد میں موجود ہیں جو روزانہ تلاوتِ قرآن کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کے حصہ میں قرآن کے رسم الخط کی تلاوت کا ثواب تو آتا ہے لیکن اس کے علاوہ اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اُن کے دامن قرآن کی ہدایت و راہنمائی سے بالعموم خالی ہی رہتے ہیں۔ حفاظ کرام میں اکثریت اُن کی ہے جنہوں نے قرآن نہیں بلکہ قرآن کا رسم الخط حفظ کیا ہے۔ انہیں اُس قرآن کا حافظ کہنا درست نہیں ہے جو ھُدًی لِلنَّاس ہے۔

ایصالِ ثواب کے لئے اور کاروبار یا عہدے میں ترقی کے لئے تلاوتِ قرآن کی رسم تو گھر گھر

نظر آتی ہے لیکن اس سے ہدایت حاصل کرنے کی رسم کہاں ہے اور کتنی ہے؟

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری مساجد جمعہ کے جمعہ آباد ہوتی ہیں لیکن وہاں سے ہمیں کیا ملتا ہے؟ فقہ فیسد سے زائد متفق علیہ مسائل پر تو کوئی بات نہیں کرتا الّا ماشاءاللہ۔ ہماری ساری توجہ اختلافی مسائل پر مرتکز ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف بُلانے والے کتنے ہیں اور اپنے فرقے اور مسلک کی طرف بُلانے والے علماء کتنے ہیں؟ سوچیے ہمارا علم اور ہماری صلاحیتیں کہاں صرف ہو رہی ہیں؟

اب ذرا اس پر بھی غور کریں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کیوں بتائی؟ کیا یہ ایک مجرد پیشین گوئی ہے یا اس کا کوئی مقصد بھی ہے؟ عام طور پر اس قسم کی احادیث سُن کر یا پڑھ کے ہم تعریف کرتے ہیں کہ آپؐ نے کیسی سچی پیشین گوئی کی تھی جو حرف بحرف پوری اتری۔ لیکن اس سے آگے اس کے مقصد پر ہماری نظر نہیں جاتی۔ اگر ہم نے قرآن سمجھ کے پڑھا ہوتا تو ہمیں معلوم ہوتا کہ آپؐ کے فرائضِ منصبی میں ایک اہم فرض اِنذار یعنی خبردار کرنا بھی تھا تب مقصد بھی سمجھ میں آتا کہ دراصل ہمیں خبردار کیا گیا ہے تاکہ ہم ایسی صورتِ حال سے بچنے اور اس کی اصلاح کی جدوجہد کریں۔

اب ذرا اپنے دل کو ٹٹول کے دیکھیں۔ کیا اس میں اللہ کے حبیب اور رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی عقیدت و محبت موجود ہے؟ مجھے یقین ہے کہ یہ محبت ہر مسلمان کے دل میں موجود ہے۔ اب غور کیجئے کہ اس محبت کا تقاضا کیا ہے؟ اپنی امت کے موجودہ حال پر یقیناً آپؐ کو تکلیف ہوتی ہوگی۔ آپؐ سے محبت کا تقاضا ہے کہ ہم موجودہ صورت حال کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اصلاح کا طریقہ کار آپؐ کے مذکورہ بالا ارشادِ مبارک میں موجود ہے۔ قرآن اور حدیث کا علم عام ہو جائے تو قرآن کو اس کی رُوح واپس مل جائے گی۔ اور اسلام پر سے اجارہ داریاں ختم ہو جائیں گی۔ اس طرح اسلام کو بھی اپنی رُوح واپس مل جائے گی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ علم کس طرح عام ہو؟ اس کا صرف اور صرف ایک طریقہ ہے کہ ہر وہ اُمتی جو اپنے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھوڑی سی بھی محبت محسوس کرتا ہے وہ خود اس علم کو حاصل کرنا شروع کرے اور جتنا علم حاصل کرتا رہے اسے دوسروں

تک پہنچا تا رہے تاکہ اسلام کو نئی زندگی مل جائے۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے پوری امت کو جدوجہد کرنی ہے اور اس میں ہر امتی کو اپنا حصہ ڈالنا ہے۔ جو امتی بھی اس میں حصہ لے گا اس کا کیا رتبہ اور مقام ہوگا، یہ بات بھی مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بتا دی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو موت آئی (اس حال میں کہ) وہ علم کو تلاش کر رہا ہے تاکہ اس کے ذریعہ وہ اسلام کو زندہ کرے تو اس کے اور انبیاء کے درمیان جنت میں ایک درجہ کا فرق ہوگا۔ (مشکوٰۃ باب العلم۔ راوی حضرت حسنؓ)

اب اگر کسی کے دل میں تعلیم و تعلم کی اس جدوجہد میں شرکت کی خواہش پیدا ہوتی ہے لیکن اپنی دفتری اور کاروباری مصروفیات کے پیش نظر وہ خود کو مجبور پاتا ہے تو اسے سمجھ جانا چاہیئے کہ اس کے دل میں دنیا کی محبت اللہ اور اس کے رسولؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت پر غالب آچکی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ سورۂ توبہ کی یہ آیت مطالعہ کرے۔

"(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کی راہ میں جدوجہد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو (جاؤ اور) انتظار کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔" (آیت نمبر ۲۴)

ذہن میں یہ بات واضح کرلیں کہ اس آیت میں دنیا کی محبت کی نفی نہیں ہے۔ ان محبتوں کو حرام قرار نہیں دیا گیا ہے۔ تقاضا صرف اتنا ہے کہ ان محبتوں کو اللہ کی محبت پر غالب نہ آنے دیا جائے۔ اس نقطۂ نظر سے اپنے نظام الاوقات کا ایمانداری سے تجزیہ کیجئے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ۲۴ گھنٹوں میں سے صرف ایک گھنٹہ آپ مطالعۂ قرآن اور دیگر دینی کتب و رسائل کے مطالعہ کے لئے وقف کرسکیں۔ یہ بالکل ممکن ہے بشرطیکہ آپ دنیا کی محبتوں کو ان کی حدود کے اندر رکھیں۔

ابتداءً یہ کام مشکل اور بھاری نظر آتا ہے۔ آدمی کی ہمت چھوٹ چھوٹ جاتی ہے

لیکن یقین کریں یہ صرف شیطانی وسوسہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۲۴ گھنٹوں میں سے صرف ایک گھنٹہ یا آدھا گھنٹہ اس کام کے لئے وقف کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ مسئلہ صرف مطالعہ شروع کرنے کا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے سردیوں میں نہاتے وقت بدن پر پہلا چھینٹا ڈالنا۔ ایک مرتبہ عزمِ صمیم کے ساتھ مطالعۂ قرآن کا آغاز کر دیں پھر آپ کو دلچسپی بھی پیدا ہو جائے گی اور یہ کام آسان معلوم ہونے لگے گا۔ یہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے۔

" اور جن لوگوں نے ہمارے لئے جدوجہد کی، ہم لازماً انہیں ہدایت دینگے۔
اپنی راہوں کی اور یقیناً اللہ نیکی والوں کے ساتھ ہے۔"

(سورۃ عنکبوت ۔ آیت : ۶۹)

اپنے ربّ کریم کے وعدے پر یقین کریں اور مطالعہ کا آغاز کر دیں۔ پھر آپ کے دل میں انشاءاللہ تعالیٰ خود ہی طلب پیدا ہوگی، جذبہ اور شوق بیدار ہوگا کہ آپ قرآن کا اور اس کے دین کا کسی استاد کے زیرِ نگرانی باضابطہ علم حاصل کریں۔ اس راہ میں آپ تھوڑی سی جستجو کریں گے تو آپ کو بڑی خوشگوار حیرت ہوگی کہ اگرچہ دینی مدارس میں اب تعلیم کا وہ معیار نہیں رہا اور وہاں سے سندِ فراغت حاصل کرنے والوں میں بہت سے دنیا دار بھی ہوتے ہیں تاہم ایسے علماءِ حق بھی اس دَور میں موجود ہیں جو رسوخ فی العلم رکھتے ہیں۔ آج بھی تقریباً ہر شہر اور ہر قصبہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بڑے خلوص اور محبّت سے آپ کو یہ علم دینے کے لئے چشم براہ ہیں۔ یہ باضابطہ علم حاصل کر کے آپ اس قابل ہوں گے کہ اسے دوسروں تک پہنچا کر احیاءِ اسلام کی جدوجہد میں اس نیت سے شرکت کر سکیں کہ جنّت کی دائمی سوسائٹی میں آپ کے اور انبیاء کے STATUS میں صرف ایک درجہ کا فرق ہو۔

ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے اور فیصلہ کیجئے! اِس دنیا میں ہم اپنا سب کچھ تج کے اپنے لئے کوئی بھی STATUS بنالیں وہ بہرحال یہیں رہ جائے گا۔ جنّت کی سوسائٹی میں وہ ہمارے کام نہیں آئے گا۔ وہاں پر ہمارے رتبہ کا تعیّن اس بنیاد پر نہیں ہوگا کہ اس دنیا میں ہمارا کیا درجہ اور رُتبہ تھا۔ بلکہ اس کا تعیّن ہمارے اُن اعمال کی بنیاد پر ہوگا جو اِس دنیا

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

اشاریہ حکمتِ قرآن جلد ۶

جنوری ۱۹۸۷ء تا دسمبر ۱۹۸۷ء

مرتّب: حافظ خالد محمود خضر

قرآنیات

درس و تفسیر

اسرار احمد، ڈاکٹر

درسِ قرآن	سورۃ محمدؐ	(قسط: ۵)	فروری ۱۹۸۷ء صـ۱۹
〃	〃	(〃 : ۶)	اپریل 〃 صـ۱۱
〃	〃	(〃 : ۷)	جولائی اگست 〃 صـ۷
〃	〃	(〃 : ۸)	اکتوبر 〃 صـ۱۱
〃	〃	(〃 : ۹)	دسمبر 〃 صـ۹

امینی، مولانا محمد تقی

ہدایت القرآن

(قسط: ۱۱) آخرت کا ثبوت	جنوری 〃	صـ۱۲
(قسط: ۱۲) 〃 〃	فروری 〃	صـ۱۳
(قسط: ۱۳) جنت کی تربیتی زندگی	مارچ 〃	صـ۱۵

(قسط: ۱۴) ہدایت کے بارے میں قوم بنی اسرائیل سے خطاب — اپریل ۱۹۸۷ء — ص۳
(" ۱۵) قوم بنی اسرائیل کی احسان فراموشی وگمراہی — جون " — ص۲۹
(" ۱۶) " " " " — جولائی اگست " — ص۳
(" ۱۷) " " " " — ستمبر " — ص۳
(" ۱۸) " " " " — اکتوبر " — ص۴
(" ۱۹) قوموں کی ذلت وپستی کا سبب — نومبر " — ص۵
(" ۲۰) شرعی حکم پر عمل کرنے میں زندگی کی صلاحیت — دسمبر " — ص۳

علوم القرآن

احمد یار، پروفیسر حافظ

خدمت قرآن کے میدان — جولائی اگست " — ص۲۳

ارفاق ملک

THE GREAT BRAIN ROBBERY
THEORY OF 19 – A GREAT HOAX — جنوری " — ص۲۷

اصلاحی، ڈاکٹر محمد اجمل (مترجم)

افادات فراہی —— قرآن مجید کا طرز استدلال — جنوری " — ص۲۲

اطہر مبارکپوری

غیرمسلم اور قرآن سے استفادہ — نومبر " — ص۲۷

مظہر صدیقی، ڈاکٹر محمد یسین (مترجم)

صدر اوّل میں تفسیر قرآن کے مصادر (۱) — اپریل " — ص۲۱

صدرِ اوّل میں تفسیرِ قرآن کے مصادر (۲) — مئی ۱۹۸۷ء — ص۲۷

ہاشمی، مولانا عبدالقدوس ندوی

قرآن مجید اور عدد ۱۹ — جنوری ” — ص۵۱

سیرت

قاسمی، مولانا اخلاق حسین

حضورؐ پر جادو کا واقعہ اور محدث کشمیریؒ کی توجیہ — نومبر ” — ص۲۱

محمد سلیمان

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے — ” ” — ص[illegible]

دعوت و تحریک

اسرار احمد، ڈاکٹر

دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر

(۱) قرآن حکیم قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد — جنوری ” — ص۱۵
(۲) اسلام برصغیر پاک و ہند میں — فروری ” — ص۲۵
(۳) تحریک رجوع الی القرآن — مارچ ” — ص۲۱
(۴) مرکزی انجمن خدام القرآن اور اس کا مؤسس — اپریل ” — ص۷
(۵) اسلام کی نشأۃ ثانیہ ـــــ کرنے کا اصل کام — جون ” — ص۳۱
اسلام کی تاریخ میں 'عقل' اور 'نقل' کی کشمکش کے دو اہم دور — ستمبر ” — ص۷
علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین چند درمیانی راہیں — ” ” — ص۱۷

حکم و عبر ـــ ہدایتِ قرآنی کے چار پہلو اور قرآن کالج کا منصوبہ — جون ۱۹۸۷ء ص ۳

لطف الرحمٰن خاں

جہاد فی سبیل اللہ اور ہماری ذمہ داریاں — جولائی اگست ” ص ۸۷
علمِ دین کا حصول ، وقت کی اہم ضرورت — دسمبر ” ص ۵۳

لطف الرحمٰن خاں / عاکف سعید (مرتبین)

قرآن کالج (پراسپکٹس) — مارچ ” ص ۵۳

دفاعِ اسلام

ابصار احمد ، ڈاکٹر

دو جدید الہیاتی مفکرین کا تقابلی جائزہ — جولائی اگست ” ص ۲۵
حکم و عبر ـــ اسلام اور سیکولرازم — مارچ ” ص ۳

عابد، عبد الکریم

پرویز صاحب کے افکار کا شجرۂ نسب (۱) — اپریل ” ص ۵۵
” ” ” ” ” ” (۲) — مئی ” ”
” ” ” ” ” ” (۳) — جولائی اگست ” ص ۴۷

علوی ، مولانا سعید الرحمٰن

حکم و عبر ـــ جسدِ ملی کے ناسور فکرِ ولی اللّٰہی کی روشنی میں — فروری ” ص ۴

مقصود احمد، حافظ

سائنس کی بے خدائیت ، انسانیت کی ڈوبتی کشتی — دسمبر ۱۹۸۷ء ص۴۳

افادات ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

منشورِ اسلام (۱) — فروری " ص۴۹
" " (۲) — مارچ " ص۴۱
" " (۳) — مئی " ص۳۵
" " (۴) — جون " ص۵۵
(۵) — جولائی، اگست " ص۴۲
" " (۶) — ستمبر " ص۴۹
" " (۷) — اکتوبر " ص۲۵
" " (۸) — نومبر " ص۱۱

حکمتِ اقبال

(۱) حکمتِ اقبال پر ایک عمومی نظر — جنوری " ص۳۲
(۲) آرزوئے حُسن اور علم کا باہمی تعلق — فروری " ص۵۹
(۳) وجدان اور عقلی استدلال کا تعلق — اپریل " ص۲۱
(۴) حکمت اقبال کی خصوصیت — مئی " ص۴۴
(۵) غلط فلسفہ بھی غلط محبت سے پیدا ہوتا ہے — جولائی اگست " ص۵۳
(۶) اقبال کا مقام عظیم — ستمبر " ص۲۵
(۷) اقبال کے افکار حکمت مغرب سے ماخوذ نہیں — اکتوبر " ص۲۹
(۸) فلسفۂ خودی کی تشریح ہمیشہ ترقی کرتی رہے گی۔ — نومبر " ص۴۷
(۹) خودی کی حقیقت — دسمبر " ص۲۱

توضیح وتنقیح

اثیر، نصرت علی

مرویاتِ خطیب بغدادیؒ اور سیرت امام ابوحنیفہؒ — اکتوبر ۱۹۸۷ء — ص۵۹

قاسمی، مولانا اخلاق حسین

غلبۂ حال اور حضرات انبیائے کرام — جنوری 〃 — ص۵۳
مولانا آزاد اور وحدت دین — اکتوبر 〃 — ص۴۷

متفرقات

ابصار احمد، ڈاکٹر

حکم دعبر —— فکرِ اقبال اور مجلس بیادِ اقبال — جنوری ۱۹۸۷ — ص۵

ظفر الحق، قاضی

اتحادِ امت کی حقیقی بنیادیں — نومبر 〃 — ص۵۶

لطف الرحمن خاں

مرکزی انجمن کی سالانہ رپورٹ (۱۹۸۶ء) — جون 〃 — ص۶۵
دھندلے سائے ——
اراکین انجمن کی خدمت میں چند گزارشات — جولائی اگست 〃 — ص۹۵

محمد طاسین، مولانا

ربوٰ اور مضاربت میں فرق — دسمبر 〃 — ص۳۳

مراسلات

مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر	گلزار احمد، عثمان	فروری ۸۷ء	صـ۷
وضاحتی جواب	مولانا اخلاق حسین قاسمی، دہلی	〃 〃	〃
مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر	ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی، پشاور	مارچ 〃	صـ۵۲
حرم نبوی سے	مولانا محمد عبدالملک جامعی، مدینہ منورہ	ستمبر 〃	صـ۶۲

تبصرۂ کتب

سیدنا علیؓ	مولانا عبدالرؤف فاروقی	مئی 〃	صـ۶۳
اسلامی عقائد و اعمال	مولانا محمد منظور الوجیدی	جولائی اگست 〃	صـ۱۰۱
روح القرآن	قاضی امیر حسین القادری	〃 〃	صـ۱۰۲

اداریے

اداراتی صفحات پر "حرفِ اوّل" کے عنوان سے ہر ماہ بالعموم حافظ عاکف سعید کی تحریر شاملِ اشاعت ہوتی ہے۔ مزید برآں گاہے گاہے اضافی طور پر "حکم و عبر" کے عنوان سے ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریریں بھی بطور اداریہ شائع ہوتی رہی ہیں۔ جن کی تفصیل سابقہ صفحات میں آچکی ہے۔

●●●

بیرونِ ملک خریدارانِ حکمتِ قرآن نوٹ فرمالیں!

ماہنامہ "حکمتِ قرآن" کے بیرونِ ملک کے تمام سالانہ خریدار حضرات کے خریداری نمبر تبدیل ہو گئے ہیں۔ براہِ کرم اپنا نیا خریداری نمبر "حکمتِ قرآن" کے لفافے سے نوٹ کر لیجئے!

بقیہ : علم دین کا حصول

ہیں ہم نے اللہ کی خوشنودی اور وہاں کے درجات کے حصول کی خاطر سرانجام دیئے۔

دیکھئے! جنّت میں اگرچہ ہم انبیاء کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے اس لئے کہ نبوّت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، البتہ اُن کے درجہ سے نزدیک ترین رتبہ حاصل کرنا ممکن ہے۔ اس کا راستہ ہمارے سامنے ہے۔ مسئلہ صرف اس راہ میں پہلا قدم اٹھانے کا ہے۔ سفر خواہ ایک میل کا ہو یا ہزار میل کا ابتدا بہرحال ایک قدم سے ہوتی ہے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوشخبری بھی دی ہے کہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ اگر بندہ میری طرف ایک بالشت متوجہ ہوتا ہے۔ تو میں ایک ہاتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، اور اگر وہ ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں دو ہاتھ ادھر متوجہ ہوتا ہوں۔ اور اگر وہ چل کر میری طرف آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں" (بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی۔ راوی حضرت ابوہریرہؓ۔ منقول از تبیغی نصاب)

اگر آپ مطالعہ کا آغاز اس نیت سے کرتے ہیں کہ باضابطہ علم حاصل کر کے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی جدوجہد میں شریک ہوں گے تو نہ صرف اللہ تعالےٰ کی مدد آپ کے شاملِ حال ہوگی۔ بلکہ آپ کو وہ اعلیٰ ترین رتبہ بھی نصیب ہوگا جو حقیقی بھی ہے اور دائمی بھی۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

ڈاکٹر اسرار احمد

نے اپنی دوسری دینی اور علمی خدمات کیساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں

ایک اصلاحی تحریک

بھی برپا کی اور ــــ خطبۂ نکاح ــــ کو صرف ایک رسم

کی بجائے واقعی تذکیر و نصیحت اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنایا

اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تحریر اور ایک خطبۂ نکاح کو دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

بڑے سائز کے ۴۸ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور،

ہدیہ: ۴ روپے ــــــــ محصول ڈاک علاوہ

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ——— اور

بعثتِ محمدیؐ کی تمامی و تکمیلی شان ——— نیز

انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ———

ایسے اہم موضوعات پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کی

حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ۱۴ روپے

مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

DECEMBER 1987 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 6
NO. 12

الحمدللہ کہ جنوری ۸۸ء سے
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
کے زیر اہتمام

قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی

کے عنوان سے

خط و کتابت کورس

کا آغاز ہو رہا ہے

داخلہ بھیجنے کی آخری تاریخ ۵ جنوری ۸۷ء ہے

(نوٹ: تفصیلات کے لیے انجمن کے دفتر ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور سے پراسپکٹس طلب فرمائیں)